اپنی ڈاک کا انتظام درست کیجئے

یہاں سے نگار ہر خریدار کے نام پوری جانچ کے بعد روانہ کیا جاتا ہے، اس لئے اگر وہ گم ہوتا ہے تو اس لئے کہ آپ کی ڈاک کا انتظام درست نہیں۔ پھر بھی زیادہ سے زیادہ ۱۵ تک پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیدیجئے، ورنہ اسکے بعد قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ منیجر

چندہ سالانہ پانچ روپیہ
ششماہی تین روپیہ

نگار

نگراں : نیاز فتحپوری

ادارہ : مجدد نیازی
شوکت جہاں

جلد ۴۵ | فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۴۴ء | شمار ۵

ملاحظات ---------- ۲
لاہور اسکول کی تخلیق و ترقی ---------- عبدالمالک آروی ---------- ۴
لینن گراڈ کا محاصرہ ---------- ۱۷
مومن کے بعض اشعار کی شرح ---------- اعجاز احمد معجز سہسوانی ---------- ۲۰
برنجی شمعدان ---------- ۲۵
تغزل میں جدید رجحانات ---------- سید صفدر حسین ام-اے ---------- ۲۸
مکتوبات نیاز ---------- ۴۰
باب الاستفسار ---------- ۴۲
مالہ و ماعلیہ ---------- ۴۴
فرائیڈ اور بنتِ حوّا (نظم) ---------- ادیب سہارنپوری ---------- ۴۹
انسان کی زندگی یہی ہے (نظم) ---------- علی اختر اختر (حیدرآباد) ---------- ۵۰
غزلیں ---------- وزیرزادہ تہر عثمانی - کاوش حیدرآبادی ---------- ۵۱
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۲

حضرت نیاز فتحپوری کا معرکۃ الآرا مقالہ

مذہب کا مستقبل

جس میں مذہب کے نشو و نما کی تاریخ، اُس کے انحطاط و زوال کے اسباب اور مستقبل پر خاص انداز میں بحث کرکے بتایا گیا ہے کہ اِس وقت مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہونا چاہئے اور اِس مفہوم کو اسلام کس حد تک پورا کر سکتا ہے۔ زیر طبع ہے۔
قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ۔ جون سنہ ۴۴ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہو جائے گا۔
منیجر نگار

ملاحظات

تا چند بگویم کہ چسان ست و چساں نیست!

جماعت انسانی کی بیداری کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جس کا تعلق ملّت و مذہب سے ہے اور دوسرا وہ جسے وطنیت کہتے ہیں۔

وہ قومیں جو ملّی یا مذہبی بنیاد پر ترقی کرنا چاہتی ہیں، کہتی ہیں کہ ان کا دائرۂ عمل زیادہ وسیع ہے، کیونکہ اس میں کسی ملک یا سرزمین کی تخصیص نہیں، یہاں تک کہ اگر ایک ملّت یا مذہب کے افراد ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں تو ساری دنیا ان کا دائرۂ عمل ہے۔ وطنیت کے اصول پر ترقی کرنے والی قومیں کہتی ہیں کہ ملت و مذہب کو سامنے رکھ کر دعوتِ اتحاد دینا تنگ نظری بھی ہے اور ناقابل عمل بھی، تنگ نظری اس لئے کہ اس طرح دوسرے مذہب والے برادران وطن کے ساتھ ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتی اور ناقابل عمل اس لئے کہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک مذہب یا ملت کے تمام افراد کبھی عملی طور پر متحد ہو ہی نہیں سکتے، جب تک تمام کرۂ ارض ایک ہی حکومت سے وابستہ نہ ہو اور یہ محال ہے۔

جس حد تک تنگ نظری کا تعلق ہے ہماری رائے میں دونوں اس مرض میں مبتلا ہیں، کیونکہ ملّت و مذہب کی طرح وطنیت کا جذبہ بھی کافی محدود و تنگ ہے اور جس طرح ایک ملت و مذہب کے لوگ دوسرے مذاہب والوں سے ہمدردی نہیں رکھ سکتے، اس طرح وطنیت کا جذبہ بھی دوسرے ملک والوں کے ساتھ کسی رواداری کی اجازت نہیں دیتا۔

ترقی و اتحاد کی ایک تیسری صورت اور بھی ہے، وہ یہ کہ ملّت و وطنیت دونوں سے گزر کر "انسانیت" کو غرض مشترک قرار دیا جائے اور اس طرح ساری دنیا کے افراد ایک ہی نظام سے منسلک ہو جائیں۔ لیکن یہ صورت اتنی بلند ہے کہ شاید انسان انتہائی ترقی کے بعد بھی اس منزل تک نہیں پہونچ سکتا اس لئے اس کا ذکر ہی فضول ہے۔

بہرحال تنگ نظری سے قطع نظر ہمیں صرف قابل عمل صورتوں پر غور کرنا چاہئے اور اس میں شک نہیں کہ اس حیثیت سے صرف وطنیت ہی وہ جذبہ ہے جس پر کاربند ہو کر کوئی صورت اتحاد و ترقی کی پیدا ہو سکتی ہے۔

مغرب کی ترقی کا تعلق اس وقت مذہب سے بالکل نہیں ہے، بلکہ صرف قومیت سے ہے (مگر اس قومیت، کو ہم اُس ملّت سے تعبیر نہیں کر سکتے جس کا تعلق مذہب سے ہے) اور چونکہ یہ قومیں زمین کے خاص خاص حصوں سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے ضمناً وطنیت بھی اس میں شامل ہو گئی ہے۔

لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جس حد تک امن و سکون کا تعلق ہے، مغرب کی یہ قومی یا وطنی ترقیاں اس وقت تک بالکل

ناکام ثابت ہوئی ہیں - پچھلی جنگ میں بھی یہی قومی و وطنی رشک و عناد سبب نزاع بنا تھا اور موجودہ جنگ بھی اسی جذبہ کی علم آسودگی کا نتیجہ ہے - کہا جاتا ہے کہ معاہدہ ورسائی کی روح یہی تھی کہ یوروپ کی مختلف قوموں کو ان کے وطنوں میں خود مختار آزادانہ حیثیت دیدیجائے اور غیر کی حکومت کا دباؤ ختم کردیا جائے، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ وہاں بھی ایک قوم کے افراد مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور اکثریت و اقلیت کی تراش دور ہونا محال ہے -

اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ ہندوستان کا مستقبل کن اُصول کو سامنے رکھ کر استوار کیا جاسکتا ہے اور یہاں قومیت وطنیت یا ملت و مذہب میں سے کس چیز کو مرکز قرار دیکر ترقی کی راہیں متعین ہوسکتی ہیں -

ہماری رائے میں "ملت و مذہب" یا قومیت کا سوال تو سامنے آنا ہی نہ چاہئے، کیونکہ اس صورت میں وہی وسط یوروپ اور بلقان کی سی تقسیم کا مسئلہ سامنے آئے گا اور پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنے کے بعد بھی جھگڑا ختم نہ ہوگا، کیونکہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ وغیرہ تمام افراد کی تقسیم بہ لحاظ آبادی کبھی اس طرح نہیں ہوسکتی کہ جس حصۂ زمین میں کوئی ایک قوم آباد ہو، وہاں کوئی دوسری قوم نہ پائی جائے اور جب تک ایسا نہ ہوگا نزاع دور نہیں ہوسکتی - اس لئے اب صرف ایک صورت وطنیت کے تعلق کی ایسی رہ جاتی ہے جس پر سب کا اتفاق ہوسکتا ہے اور اس پر آیندہ ترقی کی بنیاد استوار ہوسکتی ہے -

اس میں شک نہیں کہ ہندو مسلم کلچر میں بڑا اختلاف ہے اور ان دونوں کے سوشل تعلقات میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ بیگانگی پائی جائیگی لیکن اگر ہم کلچر کے ساتھ مذہب کے سوال کو نظر انداز کردیں، تو باوجود بیگانگی باقی رہنے کے بھی اتحاد کی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جسوقت ہندو مسلم نزاع کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس میں سب سے زیادہ مذہب کو اہمیت دیجاتی ہے اور مذہب کی دنیا میں رواداری کی مثالیں ہم کو بہت کم ملتی ہیں - مثلاً آپ پاکستان ہی کو لیجئے کہ ہمارے نزدیک یہ نام ہی بالکل نامناسب ہے کیونکہ اسکے مفہوم میں ایک اور تقابلی مفہوم یہ بھی شامل ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کے علاوہ جو آبادی ہے وہ "ناپاک" ہے -

مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں کافر کے لفظ نے کیا کم نقصان ہندو مسلم اتحاد کو پہونچایا تھا کہ اس میں ایک اور توہین آمیز لفظ پاکستان کا اضافہ کیا جاتا ہے - بظاہر یہ بات بہت معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کو دوسرے پہلو سے دیکھئے اور وہ یہ کہ اگر پاکستان کے اُصول کو ہندو اس شرط پر تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہوجائیں کہ بجائے پاکستان کے اس کا نام ملکستان رکھا جائے تو کیا مسلمان اسے تسلیم کرلیں گے اور کیا انھیں غصہ نہ آئے گا - میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی مخالفت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس نام سے ہندوؤں کی تحقیر ہوتی ہے اور گو وہ زبان سے کچھ نہ کہیں، لیکن ان کا دل ضرور اسے محسوس کرتا ہوگا - بہرحال بحالات موجودہ جبکہ "زمانۂ بعد از جنگ" کی نئی تنظیم کا سوال ہر ملک کے سامنے ہے، ہم کو غور کرنا چاہئے کہ کیا ہندو مسلم نزاع دور ہوئے بغیر ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ طے ہوسکتا ہے اور اس نزاع کے دور ہونے کی کیا صورت ہوسکتی ہے - اس وقت تک ہندو مسلم نزاع کی جتنی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، ان میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں جس کا تعلق مذہب کی غلط تعبیر سے نہ ہو - میں نے اسے مذہب نہیں کہا، بلکہ مذہب کی "غلط تعبیر" کہا اور صرف اسلئے کہ جن جن باتوں پر ہندو مسلم لڑ بیٹھتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جس کا تعلق واقعی مذہب سے ہو - لیکن چونکہ یہ بات دونوں کے ذہن نشین ہوچکی ہے کہ ایک کا وجود دوسرے کی مذہبی آزادی کے منافی ہے، اس لئے یہ مغایرت رفتہ رفتہ ذاتیات تک وسیع ہوگئی اور مسلم لیگ اور مہاسبھا دونوں نے اپنی اپنی جگہ فیصلہ کرلیا کہ ہندو مسلم اتحاد بالکل محال ہے - اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ بات محال ہی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر یہ دونوں تو میں جان لیں کہ ان نزاعات دور ہونے سے پہلے اُن کے دور کرنے کی فضا پیدا کرنا ضروری ہے، تو شاید آزادی ہندوستان کا مسئلہ بڑی حد تک سلجھ سکتا ہے - اس وقت تو ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اگر کوئی فیصلہ کرنا چاہیں بھی تو نہیں کرسکتے کس راہ عمل کا متعین کرنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہے، اس لئے مقدم یہ ہے کہ پہلے اس فیصلہ و تعیین کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیں اور اسکی صورت صرف یہ ہے کہ پاکستان یا مہاسبھائی قسم کی تمام تحریکوں کو سردست ملتوی کرکے فضا کو اس گرد و غبار سے پاک کردیں جسنے ملک و حکومت کے درمیان گہرا پردہ حایل کر رکھا ہے

لاہور اسکول کی تخلیق و ترقی

اقبال، جوش اور احسان کا تقابلی مطالعہ

فروری ۱۹۳۸ء میں انجمن بہار ادب لکھنؤ کا جلسہ ہوا، مناشرہ کے دن ایک منحنی سا بوڑھا آدمی جس کا سارا جسم سیماب کی طرح مرتعش تھا، اعصاب کی کمزوریوں مگر شعر و ادب کی تمام رنگین اداؤں کے ساتھ اسٹیج پر آیا، یہ ملک کے مشہور ادیب سجاد یلدرم کی ذات تھی۔ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں "ماتھے پہ بندی" والی اپنی مشہور نظم پڑھی اور تقریر کے سلسلہ میں یہ بھی کہہ گئے کہ نہ اب لکھنؤ اسکول ہے نہ دہلی اسکول بلکہ اُردو کا اگر کوئی اسکول ہے تو وہ لاہور اسکول ہے یا دکن اسکول۔ جلسہ ختم ہوگیا اور میں آرہ واپس آگیا لیکن بات دل میں کھٹکتی رہی۔ میں اس سے قبل پنجاب کو اُردو کی تجارتی منڈی سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا، اور یہاں کے اہل قلم کے متعلق بھی میری رائے اچھی نہ تھی، لیکن جب سب سے پہلے اپریل ۱۹۴۰ء میں مجھے لاہور کی زیارت نصیب ہوئی تو نگاہوں کے سامنے سے پردے اُٹھ گئے۔ لاہور کو دیکھنے کے بعد میں نے ایسا محسوس کیا کہ کرۂ ارض سے یکایک خیابان فردوس میں پھینک دیا گیا ہوں جہاں کا ذرہ ذرہ دعوتِ نشاط ہے۔ اس میں شک نہیں اودھ کے ایک مشہور شاعر کے معیارِ رندی کا یہاں کوسوں پتہ نہ تھا، یعنی یہاں نہ قدم ڈگمگاتے تھے، نہ نظر بہکی بہکی، پھرتی تھی پھر بھی شعر و رومان کی ایک بے پناہ دنیا ساری ہستی پر چھائی جارہی تھی۔

لاہور اسکول کی تاریخ ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو اس کے چار حصے نظر آتے ہیں، پہلا عنصر تو وہی عربی اور اسلامی ادب کی اشاعت و ترویج ہے۔ یہاں بہت سے علما غیر ممالک سے آئے اور دہلی و اودھ کے علماء نے بھی پنجاب کا رخ کیا اور مسند درس و ارشاد بچھائی، ان علما میں دینیات کے افاضل بھی تھے، مثلاً علامہ حسن الصنعانی، مولانا عبداللہ بن ہادالعثمانی التلبنی، (متوفی ۹۲۲ھ) شیخ احمد بن شیخ احمد بن شیخ عبدالاحد فاروقی سہرندی۔ حضرت عثمان بن علی الہجویری (صاحب کشف المحجوب) حضرت میاں میر، حضرت خواجہ بہاءالدین زکریا اور شیخ صدرالدین وغیرہ انھیں میں سیالکوٹ کے ملا عبدالحکیم بھی تھے جن کو شاہجہاں نے سونے سے تولا۔ میں نے اقبال کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے آپ کی شاعری کے اسلامیاتی عنصر کے محرکات پر ایک مجمل رائے دی تھی لیکن سبحۃ المرجان اور خلاصۃ الاثر نظر سے گزری تو پتہ چلا کہ اقبال کا ابن رداحہ اور حسان کے روپ میں نظر آنے کا کیا سبب ہے۔ عبدالمنان وزیر آبادی، عبدالوہاب ملتانی، ابراہیم سیالکوٹی، ثناءاللہ امرتسری کے فیوض و برکات کی فضا میں اگر اقبال نے اسلامیاتی شاعری کے بہترین آثار و نقوش چھوڑے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

دوسرا عنصر جس نے لاہور اسکول اور پنجاب کی اُردو شاعری کی تعمیر میں مدد دی وہ فارسی زبان اور ایرانی تہذیب

اخلاق کی ترویج ہے۔ ہندوستان کا دارالسلطنت ہونے کی حیثیت سے لاہور ایک مدت تک علم و ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے دہلی کی طرح یہاں بھی اصفہان و شیراز کے علماء و شعرا کی آمد رہا کی ہے۔ عرفی نے مرتے وقت "دوشش وشش پنج" اسی سرزمین میں کہا تھا اور یہیں پیوند خاک ہوا۔ اس کے بعد جہانگیر کے عہد میں بھی لاہور ایرانی شعرا کا مرکز رہا اور شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ میں بھی علم و فضل کی مجلسیں یہاں گرم ہوتی رہیں۔

معتمد خاں، ملک صالح کنبوہ، اور سرخوش نے اپنے تذکروں میں جن شعراء اور صوفیہ کے قیام لاہور کے حالات لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب میں ان لوگوں نے فارسی ادب اور شاعری کا بہت پاکیزہ مذاق پیدا کر دیا تھا، یہ مذاق جہانگیر کے دور حکومت میں بہت زیادہ بلند ہو گیا اور جب دارالسلطنت پھر دہلی مقرر ہو گیا تو بھی لاہور کی مرکزیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ فارسی کا یہی رچا ہوا مذاق اور ایران کی رومانی زندگی کا یہی اثر تھا جس نے اہل پنجاب کے ذہن اور تہذیب پر گہرا اثر ڈالا۔ اور آج آپ لاہور جا کر وہاں کی سماجی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو بادی النظر میں مشکل سے آپ کو یقین آئے گا کہ آپ اودھ کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، یا کسی ایسے صوبہ سے جس کی زبان، جس کا تمدن، جس کا معاشرتی مذاق ہم سے بالکل الگ ہے۔ سرخوش نے پنجاب کے جن فارسی شعرا کا تذکرہ کیا ہے ان میں رایج سیالکوٹی، رضوان لاہوری اور ملا مفید بلخی کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے، میر جمال الدین محدث کے ایک فرزند نے بھی لاہور میں توطن اختیار کر لیا تھا اور شعر گوئی کا بہت پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، رایج تو خالص پنجابی ہیں سیالکوٹ کے سادات[1] میں تھے، سرخوش ان کو "مردیست قلندر وضع و آزاد مشرب پختہ گو" لکھتے ہیں، رضوان ایران سے آئے اور لاہور میں آباد ہو گئے ملا مفید بھی ولایت ہی سے آئے تھے اور لاہور میں رہ گئے تھے، ملا مفید کا یہ شعر ہے:

تکمہ در پیرہن نمی گنجد — از ہم آغوشی گریبانش

مصحفی نے بھی عہد محمد شاہی کے مشہور شاعر "شاہ فقیر اللہ آفریں" کا تذکرہ کیا ہے آپ کا وطن لاہور تھا، آپ سے نور العین واقف نے اصلاح لی۔ (عقد ثریا)

تیسرا عنصر جس نے لاہور اسکول کی تعمیر میں مدد دی وہ اردو شاعری کا رواج ہے۔ اس میں شک نہیں، اردو کی کلاسکل شاعری کی ترقی و ترویج میں پنجاب کا بہت کم حصہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے بحرانی دور میں یک لخت ٹھیراؤ پیدا ہو گیا تھا، فدوی لاہوری کے سوا کوئی قابل تذکرہ پنجابی شاعر نظر نہیں آتا، اس جمود کی وجہ سیاسی ہے۔ اردو شاعری کا حقیقی دور شباب عہد محمد شاہ سے شروع ہوتا ہے جو مسلمانان ہند کی سیاسی زندگی کا اہم ترین دور تھا، مغلوں کی شان و برتری میں کمی اسی وقت سے شروع ہوئی، نادر شاہ کی تاخت نے ہندوستان کی محکوم قوتوں کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کر دی، یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں دہلی کے تمدن و زندگی کی تنویر سے پنجاب کوئی اثر نہ لے سکا، مگر یہ جمود کب تک باقی رہ سکتا تھا، پنجاب ملک کا ایسا حصہ نہ تھا جہاں کوئی انقلاب نہ ہو، اور پنجاب کے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ اس ادبی انقلاب کی رہنمائی اسی کے حدود سے شروع ہوئی، پانی پت کی خوں آشام سرزمین سے حالی جیسا ادیب جلیل اور شاعر بے بدل اٹھا اور

---

[1] رایج کا نام امیر محمد علی تھا اس لئے شاید انکو سید سمجھ لیا گیا، ورنہ وہ اور شاہ آفریں دونوں قبیلہ جوئیہ سے تھے جو گوجر قوم کی ایک شاخ ہے۔ (نگار)

اور اس نے اُردو شاعری کی بالکل نئی داغ بیل ڈالی ـــــ اس میں شک نہیں پانی پت پر دہلی کے تمدنی زندگی کا گہرا اثر رہا ہے، اور اس لئے اس کو علاقہ پنجاب میں سمجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن جغرافی اعتبار سے حالی پنجاب کے فرزند تھے، انھوں نے غالب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ذوق کے مشہور شاگرد آزاد کے ساتھ ملکر لاہور میں اُردو شاعری کی ایک لہر پیدا کر دی اقبال پر حالی و آزاد کے اسی مشترکہ تخلیقی سرمایہ کا اثر پڑا، اس میں شک نہیں وہ اول اول اِدھر اُدھر بہکے، داغ سے تلمذ کا واقعہ ان کی اسی بے راہروی کی ایک یادگار ہے، اقبال کی انفرادیت کی تشکیل جن عناصر سے ہوئی ان میں حالی و آزاد کے قیام لاہور کی ادبی سرگرمیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس انفرادیت کی تکمیل اس وقت ہوئی جب اقبال یورپ گئے اور انھوں نے انگریزی اور المانوی شعراء و فلاسفہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔

اقبال کی شاعری نے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کو اثر پذیر کیا، لیکن اقبال کا یہ اثر پنجاب اور اودھ پر زیادہ گہرا رہا۔ پنجاب کے ان شعراء میں جو اقبال کے ہمعصر تھے اور جن میں قومی شاعری کی کچھ صلاحیت پائی جاتی ہے سب سے پہلے حفیظ کا نام سامنے آتا ہے، لیکن جس فضا میں ان کا نشو و نما ہوا اس نے انھیں اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا تاہم میں حفیظ کی شاعری کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن صرف چھوٹے چھوٹے ہندی نغموں اور غزلوں کی حد تک اور ان کے شاعرانہ کارناموں میں سب سے زیادہ ناقابل توجہ "شاہنامۂ اسلام" کو سمجھتا ہوں، جو شاید سب سے زیادہ مطول مجموعہ اُن کی قومی یا اسلامی نظموں کا ہے۔

یوں تو ملک میں کافی تعداد ان شعراء کی ہے جنھوں نے اقبال کی تقلید میں نظمیں لکھنی شروع کیں، اور ہمارے اُردو ادب میں اقبال کے ان مقلدوں کی بدولت بہت سا ذخیرہ جمع ہو گیا لیکن حقیقتاً اقبال کے صحیح جانشینوں میں ہمارے سامنے صرف دو ہی شاعر نظر آتے ہیں ایک جوش دوسرے احسان۔ سیماب صاحب نے بھی اس تتبع کی کوشش کی، لیکن وہ ہمارے عہد کے مصحفی ہیں، وہی شاگردوں کی بہتات، وہی قدیم و جدید ادوار میں حد فاصل بننا۔ مصحفی کی یہ ساری باتیں سیماب میں موجود ہیں۔ سیماب صاحب نے بھی جوش کی طرح اقبال کی تقلید و تتبع میں شعر گوئی کا مسلک بدل ڈالا اور اس میں شک نہیں جہاں تک فن، فکر اور سند کا تعلق ہے سیماب کے افکار اقبال سے زیادہ مختلف نہیں لیکن ان کے سارے کلام میں نہ کہیں ذہنیت کا پتہ ہے اور نہ تخلیقی عنصر کا، جذبات میں بھی نہ ولولہ ہے نہ اُمنگ، مضامین فرسودہ، اور تصورات مقلدانہ، یہ ہے سیماب کا وہ ذخیرۂ شعر جو اقبال و اقبالیات کے تتبع میں انھوں نے پیش کیا۔

سیاسیات اور جوش و اقبال

جوش میدانِ سیاست میں زیادہ سرفروش، زیادہ زور آزما نظر آتے ہیں۔ ان کے سیاسی افکار میں اقبال سے زیادہ حریت اور زیادہ خروش ہے۔ اقبال بھی ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے سوچتے ہیں، وہ بھی ہندوستان کی نکبت، زوال، اور غلامی پر خوں فشاں نظر آتے ہیں۔ انکے دل میں بھی ایک ہوک سی اُٹھتی ہے۔ لیکن جوش زیادہ بلند سطح سے نالہ کش نظر آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اقبال پنجاب کے رہنے والے تھے، جہاں مسلمان تناسب آبادی کے لحاظ سے برادران وطن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال کی تربیت ذہنی ایک خاص قسم کی مذہبی فضا میں ہوئی۔ وہ صرف یہ تصور کر سکتے تھے کہ ہندوستان کے امن و سکون کے لئے غیر مسلم اقوام سے روادارانہ تعلق بحیثیت ایک قومی عنصر کے مسلمان قوم کا اخلاقی فرض ہے ان کو کسی معاشرتی مجبوری، یا سیاسی انفعالیت کا تصور نہ تھا! اسکے برعکس جوش صوبۂ اودھ کی پیداوار ہیں جہاں مسلمانوں کی تعداد، قوت اور تعلیم برادران وطن سے بہت کم ہے اور اس پر طرہ

یہ کہ جوشؔ کی مذہبی تربیت بھی بہت ضعیف، مضمحل اور دھندلی تھی، یہی وجہ ہے کہ جوشؔ کی طنزیات میں، مذہب، پیشوایانِ مذہب، اور عموماً مذہب پر سخت قسم کی پھبتیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی نظم (مولوی) پڑھکر اگر ایک طرف ہمیں ان کی قادر الکلامی، مزاح طنز نگاری اور ہجو کے لطائف سے محظوظ ہونے کا موقع ملا، تو اسی کے ساتھ ہماری آنکھوں سے فوراً کے دو قطرے بھی ٹپک پڑے۔ جوشؔ کی یہ انتہائی محرومیت ہے کہ ان کو اقبالؔ کی طرح کسی دل والے، پاک سرشت انسان کا فیضِ صحبت نصیب نہ ہوا،

اس میں شک نہیں، جوشؔ نہایت دردمندانہ لہجہ میں قوم کو اتحاد، اور ربط باہم کی طرف بلاتا ہے لیکن، جوشؔ کی عملی سیاسی زندگی اقبالؔ سے زیادہ پست، مردہ اور بے کیف ہے، وہ سیاسی تصورات تو بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ پیش کرتے ہیں لیکن ہمارے سامنے ان کا کوئی ایسا کارنامہ نہیں جس کو ان کی عملی سیاسی زندگی کا نتیجہ کہہ سکیں، اس کے برعکس اقبالؔ نے بڑی حد تک عملی کام بھی کئے، گو ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے انھوں نے جو نظریات سیاسی پیش کئے وہ ان کے سیاسی اعمال سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔

اقبالؔ ایک مفکر تھے، فلسفی تھے، جوشؔ کا میلان اس طرف نہیں رہا ان کا سارا سرمایۂ زندگی ادب اور شعر ہیں، اقبالؔ نے اپنے قومی اور سیاسی صحیفۂ زندگی کی ترتیب نفسیات، مذہبیات، اور فلسفہ پر رکھی، اور اسلئے ان کی سیاسیات خواہ عملی ہو یا نظری، ان کی فکرِ عمیق کا نتیجہ ہوتی ہے، اس کے برعکس جوشؔ محض شاعرانہ کیفیت و حال سے کام لیتے ہیں، انکے سیاسی تصورات نفسیاتِ انسانی کے رموز و حقائق کے تجزیہ و تحلیل کا نتیجہ نہیں، جوشؔ کے دل میں ایک حال پیدا ہوتا ہے اور وہ بلا کسی فکر و تعمق اس کو ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں، جوشؔ نے اپنی قومی نظموں (آدمی دے اے خدا) اور (حُبِ وطن اور مسلمان) میں جو پیام دیا ہے وہ بہت بلند و پاکیزہ ہے، اور اس لئے قدرتی امر تھا کہ مسلمانوں کے وہ ادارے جن سے ان قومی جذبات کے پامال ہونے کا اندیشہ ہو جوشؔ کے اندر غم و غصہ پیدا کریں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک دلچسپ ہجویہ نظم "پیرزن لیگ" لکھی اور اپنے دل کا غبار نکالا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ فنی اعتبار سے یہ نظم ناقص، تشنہ اور مبہم ہے انھوں نے نہ فیصلہ کن انداز میں کوئی بات کہی اور نہ اس کے روشن یا ایجابی پہلو پر کوئی بحث کی، حالانکہ یہ بھی ایک اہم نقطۂ خیال ہونا چاہئے تھا کہ (پیرزن لیگ) کی رعنائیاں کیوں ہیں اور لوگ ان پر شیدا کیوں ہوتے جاتے ہیں، مگر جیسا کہ ہم نے ابھی سطور بالا میں عرض کیا، جوشؔ جو کچھ کہتے ہیں شاعرانہ حال میں کہہ جاتے ہیں فکر و تعمق سے ان کو کوئی کام نہیں۔

مذہبیات اور جوشؔ و اقبالؔ

اقبالؔ کی نشو و نما مذہبی فضا میں ہوئی، ان کو مذہبی بزرگوں کی پاک اور صلاح و خلوص اور للہیت پر نزدیک سے نظر ڈالنے کا موقع ملا، مذہبی اعمال، اور امرِ نواہی نے بچپن ہی سے ان پر گہرے اثرات چھوڑے، اس کے برعکس جوشؔ کو گھر کے عیش کوش تمدن سے واسطہ رہا، دونوں شاعروں کی ابتدائی زندگی کے ان اثرات کو آگے چلکر ان کی شاعرانہ شخصیت کی تعمیر میں بہت کچھ دخل ہے، اسی مذہبی تصور نے اقبالؔ کو خالص ہندوستانی شاعر بننے نہ دیا، جوشؔ اس میدان میں اقبالؔ سے آگے بڑھ گئے تو فکر و نظر میں اقبالؔ کی سی گہرائی، اور وزن، نہ پیدا کر سکے اقبالؔ سے بڑا اسلامی شاعر بننکر اس کمی کی تلافی کر دی، جوشؔ میں گو ہندوستانی شاعر بننے کے آثار و نقوش زیادہ ہیں لیکن ان میں "حال" ہے کوئی فلسفیانہ تعمق نہیں یہ کمی تھی ہی، اس پر طرہ یہ کہ جوشؔ نے اپنے مذہبی اضمحلال، یا یوں کہئے اپنی مذہبی لاپروائی کو اپنی طنزیات کے پردہ میں چھپانا چاہا اور طرفہ یہ کہ اپنی طنزیات کا موضوع بھی انھوں نے اسلامیات ہی کو قرار دیا

میں اپنی اس تحقیق کے ثبوت میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جوش کے یہاں جو مذہبی نظمیں ہیں وہ یکسر تخریبی پہلو رکھتی ہیں اور منفیانہ رنگ کی حامل ہیں یہاں تک کہ ان کی نظم (پیغمبر اسلام) میں بھی ان کا منفیانہ رنگ نہ چھپ سکا حالانکہ اپنے گمان میں جوش صاحب نے بڑی عقیدت سے یہ نظم لکھی ہے، اس اعتبار سے جوش، اقبال سے تو خیر کیا، احسان سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ اقبال دنیائے اسلام کا قابل احترام شاعر تو خیر تھا ہی مگر وہ ہندوستانی شاعر بھی تھا۔ جوش کی "ہندوستانیت" بلند سطح پر پہونچی لیکن انکا اسلامی رنگ اس قدر مضمحل اور بے آب بنکر رہ گیا کہ اُردو زبان کے نوجوان شاعر سے بھی جوش صاحب آنکھ نہیں ملا سکتے، احسان اور جوش دونوں نے "پیغمبر اسلام" پر نظمیں لکھی ہیں لیکن احسان کے یہاں ولولہ، ارادت اور کیف ہے اسکے برعکس جوش صاحب نے اپنے شک وارتیاب، اور مذہبی بے توجہی کو عقیدت کے پردہ میں چھپانا چاہا ہے۔

"ضرب کلیم" کے اس حصہ کو پیش نظر رکھئے جس میں اقبال نے اسلامیات کے سلسلہ میں نظمیں کہی ہیں اس میں شک نہیں، عہد حاضر کے اسلام، پیشوایان مذہب اور مراکز مذہب پر انھوں نے بھی طعن کئے ہیں لیکن اقبال کے لہجہ میں سوز و گداز ہے اور ان کا مطمح نظر قوم کی اصلاح ہے۔ اس کے برعکس جوش صرف طنزیات سے کام لیتے ہیں اور اس میں ایک تلخی، خشونت اور تمسخر ہوا کرتا ہے اور طنزیاتِ اقبال کا افادی رنگ، جوش کے یہاں بالکل مفقود ہے۔

اخلاقیات اور جوش و اقبال

جوش کے فکر و نشاط میں جو نظمیں مذہبیات سے متعلق کہی ہیں ان میں یہی نقص اور سطحیت پائی جاتی ہے وہ اپنی نظم (ہوشیار) میں قوم کو دین پناہوں سے متنبہ کرتے ہیں (شیطانی زہد) اور (پندار عبادت) میں مذہبی لوگوں کی بداعمالیاں پیش کرتے ہیں، (خانقاہ) اور (شیخ کی مناجات) میں مذہبی مرکز پر پھبتی کہتے ہیں "شیخ جی" کی ہجو کرتے ہوئے ان کی عبادت کی غرض و غایت کا مرقع کھینچتے ہیں لیکن ہر جگہ یا تو صرف مذہب سے کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں یا انشا کی طرح ہنسوڑ معلوم ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ ان کی تمام کتابوں میں کوئی ایسی نظم نہیں جو ان کے بلند تصور مذہبی پر دلالت کر سکے۔

ناانصافی ہوگی اگر ہم "فکر و نشاط" کی "مذہبی طنزیات" کے ساتھ "شعلہ و شبنم" کی اصلاحی نظموں کا تذکرہ نہ کریں، ان نظموں میں زیادہ اہم اور مشہور "ذاکر سے خطاب"۔ "متولیان وقف حسین آباد سے" اور "سوگواران حسین سے خطاب" ہیں بیشک ان نظموں کے ذریعہ جوش نے ایک خاص اسلامی فرقہ کی اصلاح کی ہے لیکن جوش کی ساری قومی شاعری فرقہ پرستی سے بلند نہ ہو سکی۔ اور باایں ہمہ دعوائے آزادی و لامذہبیت جوش صاحب دائرۂ "شیعیت" سے باہر نہ نکل سکے۔ یہ ہے جوش کی "اسلامی شاعری" جس پر بجائے سر دھننے کے کف افسوس ملنا چاہیئے۔

اقبال اور جوش کی شاعری میں جس طرح سیاسی اور مذہبی اختلافات ہیں اسی طرح اخلاقی اختلاف بھی ہے، اقبال سنجیدہ، محتاط اور گہرے نظر آتے ہیں یہ نتیجہ ہے اس امر کا کہ ان کی زندگی پر اسلامی اخلاق کا اثر ہے۔ اقبال کی شاعری میں ان کی بلند اخلاقی زندگی کی جھلک موجود ہے اسکے برعکس جوش کے اخلاق کے دو رخ ہیں ایک وہ جو پیداوار ہے اس فضا کی جس میں انھوں نے نشو و نما پائی، عنفوان شباب کا عہد گزارا، اور دوسرا وہ جو تجربہ، امتداد زمانہ اور وسعت تصور و مطالعہ نے ان کے اندر پیدا کیا۔ لیکن جب کوئی ہستی قوم کی متاع بن جاتی ہے تو اس کی زندگی کا ہر زاویہ معرض بحث میں آتا ہے اور اس حیثیت سے ان کی نجی زندگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جوش کی بعض نظمیں ان کے نفسی تغیر اور روحانی انقلاب کو نمایاں کرتی ہیں، اس سلسلہ میں "کالج کے نوجوانوں سے"

"مسلک جوش" اور "بلوغ حیات" قابل توجہ ہیں۔

جوش نے ان نظموں میں خود ہی اپنی زندگی کے مختلف ادوار کا تذکرہ کیا ہے اور اپنی شخصیت کے مختلف تغیر پذیر آثار و نقوش دکھائے ہیں، ان کی نظم "کالج کے نوجوانوں سے" پڑھئے ان کی حیات رنگین نظر کے سامنے آجائے گی۔ لیکن جب بعد کو تجربہ نے ان کے نظریۂ زندگی میں تبدیلی پیدا کردی تو وہ ماضی کے ان ایام کا تذکرہ حسرت کے ساتھ کرنے لگے اور نوجوانوں کو سمجھانے لگے کہ:

بس اک گمان جوانی ہے ورنہ حسن کہاں — بس اک فریب نظر ہے جمال یار نہیں
جو زخم سر سے میسر نہ ہو وہ تاج غلط، — جو خون دل سے نہ پیدا ہو وہ بہار نہیں

"یار صادق" میں بھی انھوں نے اپنی کامرانی، و اقبال مندی کے ترانے گائے ہیں جبکہ نہ صرف وہ کسی سے محبت کرتے تھے بلکہ محبت کا جواب محبت سے دیا جاتا تھا۔ فرماتے ہیں:

یہ بھی غلط کہ مجھ کو جوانی کے دور میں — کوئی قمر جمال و سمن بر نہیں ملا

یہ منزل یہیں ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ اور آگے چلتی ہے:

یہ بھی غلط کہ میری محبت کے دور کو — خود مجھ پہ جو فدا ہو وہ دلبر نہیں ملا

ان نظموں میں جوش نے اپنی ابتدائی زندگی اور اخلاق کو نمایاں کر دیا ہے — ان کے اخلاق کا یہ ابتدائی دور تھا، اس میں بتدریج ترقی ہوتی ہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ و اخلاقیات کی اس بلند سطح تک پہونچ جاتے ہیں جہاں پہونچکر بایرن نے Byronic Hero لکھی اور جوش نے "بلوغ حیات"۔ بایرن کی اس نظم اور جوش کی "بلوغ حیات" میں عجیب و غریب مماثلت ہے بایرن بھی طوفان زندگی سے نبرد آزما تھا۔ جوش نے بھی ہنگامہ و انقلاب سے زور آزمائیاں کیں آخر جذبات میں ٹھہراؤ ہوا، دونوں نے مڑکر زندگی کو دیکھا اور مسکرا دئے۔ اپنی ابتدائی ہنگامہ پرستی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی نبرد آزمائی پر نظر ڈالی اور "حسرت حاصل" سے متاثر ہوئے "بلوغ حیات" اور Byronic Hero کو سامنے رکھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے جوش نے بایرن سے متاثر ہوکر یہ نظم لکھی ہے۔ اگلے اوراق میں مینے یہ لکھا تھا کہ جوش اور بایرن میں کردار، رجحان اور نظریہ کے اعتبار سے ہم آہنگی پائی جاتی ہے — بایرن اپنی ابتدائی زندگی کا نقشہ کھینچکر اپنی نفسی تغیر پذیری، اور اخلاقی انقلاب کا تذکرہ کرتا ہے اور اپنی عظمت اور رفعت حال کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی موجودہ زندگی کا نقشہ پیش کرتا ہے اسی طرح جوش بھی اپنی تدریجی روحانی اور نفسی ترقی کا اظہار کرتے ہوئے "بلوغ حیات" کے اشعار پیش کرتے ہیں:

ایک نیا احساس اس سینے میں اب پاتا ہوں میں — دشمنی کرتے ہیں دشمن اور شرماتا ہوں میں

اور صرف یہی نہیں بلکہ

بے کس و مجبور انساں کو دعا دیتا ہوں میں — وار کرتا ہے کوئی تو مسکرا دیتا ہوں میں

یہ ہے وہ اخلاقی تبدیلی جو امتداد زمانہ، تجربہ اور تصور نے جوش کے اندر پیدا کی، وہ پہلے کیا تھے جوش و غضب ہنگامہ و معرکہ، غرور و خود بینی، جس کا بایرن تذکرہ کرتا ہے جوش میں بھی موجود تھی لیکن "زمانہ" کے زبردست ہاتھ نے روح و نفس میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ بایرن اس کو Touched by time کہتا ہے جوش بھی اسی باعث اپنے "سینہ میں اک نیا احساس پاتے ہیں"۔

فلسفہ اور جوش و اقبال

شاعری کی اس صنف میں اقبال و جوش کا کوئی موازنہ نہیں۔ نہ تو جوش کا مطالعہ وسیع نہ اقبال کی طرح باضابطہ انھوں نے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی، جوش صرف جذباتی شاعر ہیں وہ نہ کبھی مفکر رہے اور نہ مسایل کائنات پر بہ حیثیت فلسفی ہونے کے انھوں نے نظر ڈالی، حقیقت یہ ہے اقبال اپنی یہ شاعرانہ خصوصیت اپنے ساتھ لے گئے ہندوستان کے تمام شعرا میں ان کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا، جوش اپنی زندگی کی بڑی منزل تمام کر چکے اب ان سے تو ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ قدیم و جدید فلسفہ کا باضابطہ مطالعہ کرنے کی دردسری لیں گے اور ان حقایق کے امتزاج سے وہ ایک نیا ہیولیٰ طیار کر کے اُردو شاعری کو فایدہ پہونچائیں گے۔ علی اختر صاحب زاویہ گزیں ہو چکے احسان کا میلان ترقی کی طرف ہے۔ ان کی عمر اور ذوق، سے ہمیں توقعات ہیں، وہ اُبھر سکتے ہیں لیکن ان کا ساز نشاط مشاعرہ اور ریڈیو تک محدود رہ گیا ہے، اس کی ذمہ داری ہماری مجلسی اور عمرانی زندگی پر عاید ہوتی ہے۔ کاش احسان صاحب باضابطہ کچھ پڑھنے اور سیکھنے کی سعی کریں لیکن شاید وہ اپنی موجودہ زندگی پر مطمئن ہیں —— یہ قناعت یا سیر چشمی نہیں کم ہمتی ہے اور ان کے مستقبل کے لئے مہلک!

جوش کی کتابوں میں سے "شعلہ و شبنم" کی نظمیں اکثر و بیشتر فضائی تاثرات کی پیداوار ہیں اسی طرح "نقش و نگار" بھی جوش کے عمیق مشاہدات و تصورات کا نتیجہ نہیں، البتہ "فکر و نشاط" اور "حرف و حکایت" کی بعض نظمیں ہمیں چونکا دیتی ہیں اور ہم ذرا سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں، یہ نظمیں اقبال کی ایک ہلکی سی یاد دلا جاتی ہیں۔

جوش کی دو نظمیں ہیں "جوانی کا بستر مرگ" اور "جھریاں" جو اُن کی عمیق فکر کا نتیجہ ہیں، فغانی کو گلگشت چمن رُلاتا تھا وہ "ورق گل" پر اپنا منہ رکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا تھا[1]۔ جوش نے بھی "جھریوں" میں جوانی کی رعنائیاں دیکھیں اور رعنائیوں کے اس انجام پر آنسو بہانے لگا،

نظر کر جھریوں سے شیب کے سمٹے ہوئے رخ پر — یہ وہ بستر ہے دم توڑا ہے جس پر نوجوانی نے

جوش صاحب کی ایک نظم کا عنوان ہے "فریب ہستی" اس میں بھی وہ مفکر اور رمز شناس فلسفی کی طرح پھول کی تخلیق، اس کی شگفتگی، نکہت بیزی اور پھر فسردگی، پراگندگی، اور پامالی پر خوں فشانیاں کرتے ہیں اس نظم کے آخری شعر یہ ہیں:

یہ کیا نظام ہے معبود باغ ہستی کا — کھلے جو صبح کو وقت غروب کمھلائے
جب ایک پل میں ہو تعمیر ماہ و سال خراب — تو کس امید پہ کوئی فریب ہستی کھائے

اسی طرح ان کی یہ حقیقت شناسی "موتی یا شبنم" میں بھی جھلکتی ہے کس بے پناہ انداز میں فرماتے ہیں:

بدست جوانی کی آنکھیں جس چیز کو موتی کہتی ہیں — دیکھیگی جو پیری جھک کے اسے اک قطرۂ شبنم پائیگی

جوش کی نظمیں "سہاگن بیوہ" اور ایک "تقابل" ہماری معاشرت اور عمران سے متعلق ہیں، "سہاگن بیوہ" بہت لمبی ہے، یہ نظم جوش کے تمام نقوش شخصیت کی حامل ہے ان کا رومانی تصور، ان کی شاعرانہ محاکات، ان کا مصلحانہ پیام اور آخر میں ان کی فلسفیانہ بصیرت بھی نمایاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم جوش کے ماضی اور حال کا ایک آئینہ ہے ان کی کم نظمیں ایسی ہیں

---

[1] نہادم روئے بر روئے گل و از خویشتن رفتم

جن میں ان کی تمام خصوصیات یکجا اس مکمل طریقہ سے نظر آئیں۔

"ایک تقابل" میں جوش کی اخلاقی زندگی کا وہ رخ نظر آتا ہے۔ جسے میں نے پچھلی سطور میں تجربہ امتداد زمانہ اور وسعت تصور کا نتیجہ بتایا ہے "ایک تقابل"، ہمیں احسان کے تصورات درد و حزن کی یاد دلاتا ہے، احسان نے ان جمہوری تصورات کو بہت کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا ہے اور اس صنف میں اس کا کوئی مقابل نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں بڑی حد تک احسان کی آپ بیتی ہیں اس کے برخلاف جوش پر فطرت اس قدر نامہربان نہیں رہی ہے باینہمہ ان کے دل میں ایسی ہوک اُٹھنا ان کے "دل والے" ہونے کی دلیل ہے۔

پلیٹ فارم پر دو گاڑیاں آکر ٹھیرتی ہیں دوسرے درجہ کے ایک ڈبہ کے سامنے تیسرے درجہ کا ڈبہ ہے اس میں مزدور، غریب اور فلاکت زدہ انسان ہیں اول الذکر میں امرا اور سرمایہ دار سفر کر رہے ہیں، جوش دونوں ڈبے دیکھتے ہیں اور بلندی و پستی، امارت و غربت کا فرق ان کو بیتاب کر دیتا ہے۔ دیکھئے کس المناک لہجہ میں فرماتے ہیں:

اللہ اللہ اس قدر عدل و تناسب کی کمی — اُس طرف بھی آدمی تھے اس طرف بھی آدمی

جوش و احسان کا تقابلی مطالعہ

اقبال، جوش اور احسان اپنی زندگی اور تجارب زندگی کے لحاظ سے بالکل علٰحدہ علٰحدہ چیز ہیں، اقبال مفکر تھے، جوش صاحب حال، (اس سے مراد ان کی صوفیت نہیں جس کی جوش کو کبھی ہوا بھی نہ لگی بلکہ "کیفیت" ہے) اور احسان مفکر بھی ہیں اور صاحب حال بھی اقبال کے افکار کو علم حکمت نے جلادی، جوش کی ادبی بلند پایگی نے اس کے "حال" میں رفعت اور کلام میں کشش پیدا کی، لیکن افسوس ہے احسان کا دامن ان دونوں سے معرا ہے۔ رومی کو اعتراف تھا "ما از پئے سنائی و عطار آمدیم" ہمارا احسان بھی اقبال اور جوش کے نقش قدم پر چلا، احسان، اقبال اور جوش کا محض متبع کر کے مطمئن نہ رہا بلکہ اس نے اپنے اس ہیولیٰ میں اپنی انفرادیت کا تخلیقی رنگ بھی بھرا۔ احسان کی شاعری کا ہیولیٰ تین اجزا سے بنا ہے، اقبال کی گہرائی، جوش کی ادبیت، اور خود احسان کی درد بھری زندگی، یہ نقوش اس کی شاعری کے ہر ہر پہلو میں نمایاں ہیں اقبال کی طرح وہ فکر و غور سے بھی کام لیتا ہے ضبط، شب سیاہ، خواب زندگی پڑھئے تو آپ کو احسان کے مفکرانہ رجحان کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ اسی طرح جوش کی رومانیت، ادبی انداز اور شاعرانہ حال احسان کی بہت سی نظموں میں موجود ہے۔ تقابلی مطالعہ کے لئے دونوں شعرا کی بعض نظمیں قابل لحاظ ہیں[1]۔ ان نظموں کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ احسان نے جوش کا نہ صرف کافی مطالعہ کیا ہے بلکہ انھوں نے جوش کی تقلید و تتبع کی کوشش بھی کی ہے، آپ جوش کی کتاب "نقش و نگار" کے اس حصہ کو پیش نظر رکھئے جو "مطالعہ و نظر" کے عنوان کے تحت ہے، احسان نے بالکل اسی کی تقلید میں طبع آزمائیاں کی ہیں جو "جادۂ نو" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔

احسان کی انفرادیت

یوں تو احسان کا انفرادی رنگ اُن نظموں میں بھی ہے جو اس نے اقبال اور جوش کی تقلید میں کہی ہیں لیکن بعض ایسی نظمیں بھی ہیں جو صرف احسان ہی کا ذہن خلاق پیدا کر سکتا تھا، اس

---

[1] (جوش) سہاگن بیوہ (جوش) جنگل کی شہزادی۔ (جوش) گنگا کے گھاٹ پر (جوش) بھکارن شہزادی (احسان) نوعروس بیوہ، (احسان) دیہاتی دوشیزہ (احسان) ندی کے ساحل پر (احسان) افکار پریشاں۔

موضوع پر ایسی اثر انگیز نظمیں نہ اقبال نے کہی ہیں نہ جوش نے، یہ احسان کی آپ بیتی ہیں جہاں اقبال اور جوش کا ذہن پہونچ نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال تو بلندی و پستی دونوں جگہ قبولیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن جوش کو امرا زیادہ پسند کرتے ہیں اور احسان کو غربا، احسان غریبوں کا شاعر ہے۔ اس کے شعر کا موضوع بستر سنجاب کی بجائے بوریا ہے۔

احسان کی نظم "مزدور کی موت" اُردو زبان کے غیر فانی شاہکاروں میں سے ہے، جوش کی "سہاگن بیوہ" میں جس طرح جوش کی پوری شخصیت اور ان کا ماضی و حال نمایاں ہے اسی طرح "مزدور کی موت" احسان کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ صور شعریہ یا محاکات کی ایسی مثال بدیع شاید ہی اور کہیں نظر آئے احسان اگر اپنی پوری زندگی میں صرف یہی ایک نظم کہہ جاتا جب بھی اس کی حیات کی ضمانت ہو سکتی تھی، لیکن "جشن بیچارگی" لکھ کر تو اس نے اپنی شاعرانہ انفرادیت بھی منوالی۔

"مزدور کی موت"، "مزدور کا چالان" اور "جشن بیچارگی"، اسی قلم سے نکل سکتا تھا جو "میرا گھر"، "غم فاطمہ"، اور "خندۂ غرور" لکھ سکے، اقبال کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا، اور جوش بھی اس نوع کا کوئی المناک تصور نہ کر سکتے تھے۔

جوش حیدر آباد میں رہ کر ملیح آباد کو یاد کرتے ہیں۔ اپنی بے وطنی کا غم، احباب کی یاد، وطن کی فضا، سب کچھ لکھ جاتے ہیں لیکن ان کا اثر قاری پر اس قدر گہرا نہیں ہوتا جس طرح احسان "میرا گھر" میں ایک پایدار نقش چھوڑ جاتے ہیں اسی طرح جوش کی "قلب ماہیت" اور احسان کی نظم "خندۂ غرور" سامنے رکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ جوش اور احسان میں اثر آفرینی کے لحاظ سے کون کامیاب ہے۔ جوش کے لہجہ میں خشونت اور طنز ہے، احسان کے نالہ میں درد اور تلقین، جوش کا اندازِ خطاب بلیغ اور شاعرانہ ہے احسان کا انداز سلیس اور حکیمانہ، احسان کو جب مقدر نے وطن سے بہت دور پنجاب میں پھینکا تو اس کو ایک مدت کے لئے وطن کی زیارت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ اس دوران میں اس کا گھر گر گیا، ایک زمانہ کے بعد جب وہ اپنے وطن میں آتا ہے تو اپنے گھر کا نقشہ اس کو بیحد متاثر کرتا ہے، اس نے ایک نظم لکھی، جس کے آخری اشعار تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ کہتا ہے

وقت کی آندھی نے جا پھینکا مجھے پنجاب میں — اک قیامت کا سماں تھا اس پریشاں خواب میں
میں تو اپنی سخت جانی سے یہ صدمہ سہ گیا — میرے غم میں میرا گھر برباد ہو کر رہ گیا
آج اپنے اس شکستہ گھر میں پھر آیا ہوں میں — بے بسی کے چند آنسو نذر کو لایا ہوں میں

اور آخری شعر میں تو گویا دل نکال کر رکھ دیا ہے:

دل بھر آتا ہے روکوں کس طرح انسان ہوں — آہ میں اپنے وطن میں ہوں مگر مہماں ہوں

یہ ہوک اقبال اور جوش کے دل میں کہاں سے آتی۔

احسان لایل پور (پنجاب) کے ایک مشاعرہ میں جاتا ہے، اس کا لباس پھٹا اور پرانا اس کی ہیئت غریبی اور مفلسی کی تصویر اس کا ایک نادان دوست "انور" ہنس پڑتا ہے، انور کی یہ بے محل ہنسی احسان کے دل و دماغ پر ایک جانکاہ اثر ڈالتی ہے، شاعر ہے اور پہلو میں ایک نازک دل رکھتا ہے احساس کروٹ لیتا ہے، اس کیفیت کو اسنے "خندۂ غرور" میں پیش کیا ہے۔

یہ نظم احسان کے باطنی اخلاق اور سرشت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے، جوش نے بھی دکن میں اپنے ایک دوست "مدعی ہوش؟ ہوش!" کو بدلا ہوا پایا، ایک نظم لکھی، اور جذبات کو سیراب کیا۔ جوش بلاغت بیان اور ادبی مہارت کے لحاظ سے بہت کامیاب ہیں لیکن اسی کے ساتھ لہجہ میں سختی، اور بیان میں طنز، غم اور عتاب پایا جاتا ہے، اس کے برعکس احسان

بہت ہی نرمی، سلاست اور صفائی کے ساتھ دوست کے دل و دماغ میں ایک اخلاقی ردعمل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جوش کی طرح احسان نے طنز، غم اور غصہ کا اظہار نہ کیا بلکہ ایک حکیم کی طرح مرض کی ماہیت پیش کی اور اس کے برے اثرات کا مرقع کھینچا۔ دیکھئے کس پُراثر انداز میں کہتا ہے:

بے خبر، یہ تری بے وقت ہنسی خوب نہیں ایسی باتیں مرے اللہ کو مرغوب نہیں

ہمارے نوجوان شاعر نے جس حکیمانہ انداز میں "انور" کو سمجھایا ہے اس سے بہتر طریقۂ موعظت اخلاقیات کی عملی تاریخ میں نہیں ملسکتی ۔ لاہور میں قلعہ کی دیوار زیر مرمت ہے، احسان مزدوری کرتا ہے اور ایک لغزش کے باعث قلعہ کی دیوار سے گر پڑتا ہے، ایک عورت "کنیز فاطمہ" اس کو بے پناہ سمجھ کر اپنے گھر لے آتی ہے تیمار داری کرتی ہے۔ احسان اس ہمدرد عورت کو بہن کی طرح چاہنے لگتا ہے، اور جب مرتی ہے تو اس کا ایک پر درد مرثیہ لکھتا ہے، یہ نظم "غم فاطمہ" کے عنوان سے ہے، احسان نے اس نظم میں جس والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے اس سے اس کی شرافت اخلاق، اور محسن پرستی کا اظہار ہوتا ہے،

تیری اُلفت کا ہوں قایل مرے خوابوں میں نہ آ جانتا ہوں تری تعمیر وفا خام نہیں

اور آخری شعر میں اپنی منھ بولی بہن، کے غم میں جس تاثر کا اظہار کیا ہے اس سے احسان کے غیر معمولی جذبۂ وفاشعاری، کا ثبوت ملتا ہے:۔

خواہشِ مرگ جوانی پہ جیئے جاتا ہوں زندگی زہر ہے مجبور پیئے جاتا ہوں

احسان کا رنگ تغزل

احسان نے اُردو زبان میں بہ حیثیت نظم نگار شہرت حاصل کی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ غزل گو کی حیثیت سے ناکامیاب ہیں اس باب میں جتنی رائیں ہیں وہ یا تو نتیجہ ہیں اس امر کا کہ اُردو ادب کے بعض نقادوں نے محض اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر صحیح تنقید نہ کی یا ان میں بعض نے دیدۂ و دانستہ ناانصافی کی، اس باب میں نیاز صاحب نے جو رائے دی ہے وہ تنقید صحیح اور مذاق سلیم کی بہترین[1] مثال ہے۔

اقبال اور جوش

اقبال، جوش، اور احسان تینوں نے غزلیں کہیں ہیں اقبال کی رہبری داغ کے ہاتھ آئی تھی، داغ گو ہماری زبان کا ایک ناقابل فراموش شاعر تھا، لیکن اقبال کا رجحان مذاق اس سے بالکل مختلف تھا اقبال سنبھل گیا، ورنہ گمراہ ہوجاتا، اور ہمارا ادب ایک بہت بڑے ذخیرۂ شعر سے محروم ہوجاتا، اقبال نے جو غزلیں کہیں ہیں ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی، جوش کا حال اس سے بھی بدتر ہے، جوش غزل کے مخالف ہیں، ملک میں اس پر ہنگامہ ہوا، اور میرا خیال ہے یہ ہنگامہ بیجا بھی نہ تھا، جوش میں صلاحیت ہی نہ تھی کہ دور حاضر کی غزل گوئی کا ساتھ دے سکیں، ان کا ذوق، ریاض، امیر اور داغ کا رنگ چاہتا تھا، اودھ کی شمع حکومت کے بجھ جانے کے بعد اُردو شاعری کے مذاق میں ایک انقلاب پیدا ہوچکا تھا، اس انقلاب نے اگر ایک طرف اصغر، اور جگر، پیدا کئے تو دوسری طرف حسرت اور فانی، اب احساس اور پسند میں اتنی تبدیلی ہوچکی تھی کہ "صنمخانہ" اور "گلزار" کے لئے ہمارے ادب میں مزید گنجایش نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ جوش کو باندازۂ تمنا غزل گوئی میں کامیابی نہ ہوئی، اب اس "جراحت ناکامی" کو انھوں نے دوسرے روپ میں پیش کرنا شروع کردیا، جوش اگر خموش رہجاتے اور نظموں پر اکتفا کرلیتے تو ان سے کوئی محاسبہ نہ کرتا، لیکن جب انھوں نے اپنی ناکامی پر انتقام کی یہ صورت نکالی تو دنیائے نقد ادب میں ایک شورش پیدا ہوئی۔

---

[1] نگار۔ سالنامہ ۴۳ء

جوش صاحب غزل گو کی حیثیت سے ناکامیاب ہیں، کم مشق ہیں، ان کی غزلوں میں ان کا کوئی انفرادی رنگ نہیں، انھوں نے ناصح مشفق کی حیثیت سے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس میں نہ کوئی کشش ہے اور نہ کوئی واقعیت، جوش صاحب فرماتے ہیں:

آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیب روسیاہ کر چکا ہے زندگی جو میر و مومن کی تباہ

تعجب ہے جوش صاحب کے ذوق پر اور حیرت ہے ان کے اس مہمل فیصلہ پر، کیا تغزل، میں صرف "رقیب روسیاہ" کی گلہ پردازیاں ہوا کرتی ہیں، اور کیا واقعتہً "میر و مومن" اپنے افکار عالیہ کا دفتر چھوڑ کر اپنے کو تباہ کر گئے اگر میر تباہ ہو گیا، مومن ناکام رہا تو جوش صاحب کا اپنے باب میں کیا فیصلہ ہے؟۔

میر تو تباہ ہونے کے بعد بھی دو سو برس سے بچہ بچہ کی زبان پر ہے، میر حسن، ناسخ، اور غالب ہی اس کا اعتراف نہیں کرتے بلکہ آج بھی جبکہ اُردو شاعری نے نئے اسالیب اختیار کر لئے ہیں میر و مومن کا اُردو ادب میں ایک خاص مقام ہے، جوش صاحب کا یہ نقد تغزل اپنی بے بسی اور کمزوری کو بے نقاب کر رہا ہے، جوش صاحب نے اپنے زعم میں مسلسل غزلیں کہکر ایک اسلوب جدید کی بنیاد ڈالی ہے اور دنیا میں اپنے تجدد، اور بدیعۂ فکر کی ایک یادگار چھوڑنا چاہتے ہیں، یہ اور بھی بے معنی اور مہمل سی چیز ہو کر رہ گئی ہیں، بات یہ ہے کہ جوش صاحب جس پایہ کی نظمیں کہتے ہیں غزلیں نہیں کہہ سکتے، نظم تسلسل چاہتی ہے اور غزل بے ربطگی، نظم میں ایک تصور کو پھیلا کر بیان کرنے کی وسعت ہے، غزل میں ہر شعر ایک داستان کی اجمالی تصویر ہوا کرتا ہے، نظمیں لکھتے لکھتے جوش صاحب تسلسل کے عادی ہو گئے ہیں غزلوں میں بھی وہ اس سے نہیں بچ سکتے اور غزل کی نزاکت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی، اپنے بیان میں جوش صاحب کو جب یہ نقص نظر آیا، اور باوجود کوشش بھی وہ اس کو دور نہ کر سکے، تو پھر اس عیب کو ہنر بنانے کے لئے انھوں نے مسلسل غزلیں کہنی شروع کیں اور داد چاہنے لگے، لیکن

"کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے"۔ یہ راز کھل کر رہا۔

احسان غزل گوئی کے اعتبار سے اقبال اور جوش دونوں سے زیادہ کامیاب ہے اس کی غزلیں بہت بلند ہیں، وہ قدرت کی طرف سے غزل گو ہی بننے کے لئے آیا تھا لیکن فضا اور ماحول نے اس کو نظم نگار بنا دیا، اس کے تغزل کا حقیقی رنگ اسکی ہر نظم میں موجود ہے، اور جب وہ غزل کہنے لگتا ہے تو مشکل سے یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ غزل گو شاعر نہیں بلکہ نظم نگار ہے۔

احسان کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آہ اس عاشق ناشاد کا جینا اے دوست جس کو مرنا بھی ترے عشق میں مشکل ہو جائے

وہ مسکرا رہے ہیں بہ انداز دلبری، یہ میرے ضبط غم کا کہیں امتحاں نہ ہو

نہ جانے محبت کا انجام کیا ہے میں اب ہر تسلی سے گھبرا رہا ہوں

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

نشیمن کے وہ بے ترتیب تنکے ہائے کیا شے تھی قفس میں آج تک خواب گلستاں دیکھ لیتا ہوں

یہ کس نے دم مرگ صورت دکھا دی میرے دل سے جینے کی حسرت مٹا دی

دیکھ اے دل وہ اُٹھ رہی ہے نقاب اب نظر آزمائی حیرانی ہے،

سیماب وار ہے یہ دل بے قرار کیوں اللہ کوئی زینت محفل نہیں رہا،

نسائیات اس باب میں اقبال کا پیام بہت ہی متین اور سنجیدہ ہے اقبال کی نسائیات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم ان کو حکیم و صوفی کہہ سکتے ہیں یا پھر لیڈر لیکن شاعر نہیں کہہ سکتے، اس قدر محتاط انداز سے اور اس قدر بچ بچ کر انھوں نے نسائیات پر طبع آزمائیاں کی ہیں کہ شعر میں حلاوت کی بجائے فلسفہ کا روکھاپن آگیا ہے، اقبال طبعاً محتاط تھے، اخلاق و عادات پر اسلامی بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا گہرا اثر تھا۔ احسان نسائیات میں اقبال اور جوش کے درمیانی راہ پر ہیں، وہ ابتدا کرتے ہیں جوش سے، لیکن ختم کرتے ہیں اقبال پر۔

بعض نظموں کی ابتدا تو انھوں نے جوش کی نظموں کو سامنے رکھ کر کی ہے مثلاً "دیہاتی دوشیزہ" کے ابتدائی اشعار پڑھئے اور "جنگل کی شہزادی" پر ایک نظر ڈالئے تو آپ کو یہ تتبع صاف نظر آئے گا۔ احسان کی شاعری گو پنجاب میں پروان چڑھی لیکن وہاں کی رومانی فضا کا اثر احسان پر نہیں، احسان زندگی کے جن سخت مراحل سے گزرا وہاں عشق و رومان کی فرصت کہاں! اسکی زندگی تو ان دھڑکوں میں گزری کہ کل کا دن آلام کی کونسی نئی تلخی لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احسان کے پورے سرمایۂ خیال میں ہمیں جوانی کی امنگیں بہت کم نظر آتی ہیں حالانکہ جس سہ زمین سے اس کا تعلق ہے وہاں "ریاض" و "امیر" کا رچا ہوا مذاق پھیلا ہوا تھا۔ اور اگر اس کو سکون ملتا تو ممکن ہے وہ کچھ مزہ کی باتیں بھی کہہ جاتا۔ دیکھئے اس کا یہ شعر اس کی دبی ہوئی آرزو کی ایک دھندلی سی تصویر ہے۔

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو — تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

لیکن اس کا یہ رنگ بالکل دب گیا ایسا دبا کہ باوجود کوشش کے بھی وہ اس کو نہ اُبھار سکا، اس میں شک نہیں کہ اس نوع کی شاعری میں احسان نے جوش کی تقلید کی لیکن اس کی زندگی جن حالات میں بسر ہوئی وہ اس تقلید کے منافی تھے۔ اس نے "دیہاتی دوشیزہ" ولولہ کے ساتھ لکھی لیکن اس کا ولولہ خستگیِ دہر کے تصور میں گم ہوگیا، رومان سے ابتدا کی لیکن وہی رومان اصلاح جمہور کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ گیا، احسان کی دوسری نظمیں "گھاس والی" اور "مزدور عورت" بھی اس خیال کی تائید کرتی ہیں، اور عشق و مجبوری کے دوراہہ پر "ایک حادثہ" لکھ کر تو انھوں نے گویا ان تمام انتقادی اسرار کا اعتراف کرلیا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ہمیشہ رومانیت کو معاشرتی مسایل سے مسل ڈالتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ماحول اور فضا سے بے نیاز بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن ایسی نظموں میں وہ اثیریت اور وہ ولولہ نہیں ہوتا جو مزدور اور اس کی کہانیوں کی تمثیل میں اس کے یہاں پایا جاتا ہے۔

جوش کے یہاں ایک نقص بھی ہے، جوش، عورت کا رومانی تصور تو کرسکتے ہیں لیکن اس کے دوسرے اخلاقی لطائف اور جمہوری افادات پر روشنی نہیں ڈال سکتے، یہاں تک کہ خانقاہ میں بھی ان کو عورت کی فتنہ سامانیاں ہی نظر آتی ہیں اور کسی بزرگ کی صحبت میں بھی وہ اس کی اٹھکھیلیاں ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس احسان کے یہاں عورت کا رومانی تصور تو یقیناً فسردہ، اکثر بے آب و رنگ، اور مضمحل ہے لیکن عورت کے دوسرے اخلاقی اور جمہوری فضایل پر اس نے جو نکتہ سنجیاں کی ہیں ان کو پڑھنے کے بعد ہم اسکو اقبال سے بہت قریب پاتے ہیں، جوش اس اعتبار سے احسان سے پیچھے ہیں۔ احسان نے "پردہ" اور "غمزدہ" لکھ کر نسائیات پر عقیدت کے جو پھول چڑھائے ہیں ان کو ہماری سوسائٹی اور ہمارا ادب فراموش نہیں کرسکتا۔

احسان، جوش کی طرح دل کی گہرائی سے مذہب اور اسلامی معاشرت کا احترام کرتا ہے ۔ "غمزدہ" میں احسان نے ایک سچی کہانی نقل کی ہے۔ نور کے تڑکے اس کا گزر گورستان کی طرف ہوتا ہے وہاں ایک کمسن حسین بیوہ اپنے شوہر کی قبر سے چمٹی ہوئی نالہ و شیون کر رہی ہے، یہاں پر عورت کے علوئے اخلاق اور وفاکیشی پر اس نے جو تصورات پیش کئے ہیں انکو پڑھنے کے بعد بے اختیارانہ ہمیں فیضی کی "نل دمن" یاد آجاتی ہے۔ نل جب دمینتی کو تنہا چھوڑ کر آوارۂ غربت ہوتا ہے تو دمن پر جوش جنوں طاری ہو جاتا ہے وہ دیوانہ وار پہاڑوں، دریاؤں اور درختوں سے نل کا حال پوچھتی ہے احسان نے عورت کے اسی ایثار بے پناہ اور عشق و وفا کی تمثیل لکھی ہے۔ اس نظم کا آخری شعر ہے:-

صنف نازک کی وفا میں ہمت مردانہ ہے — شمع کشتہ پر بھی جلتا ہے یہ وہ پروانہ ہے

عورت کا یہی پر احترام تصور تھا جس نے احسان سے اپنی والدہ ماجدہ کی وفات پر "گورستان" لکھائی، یہ نظم بڑی طویل اور پُرکیف ہے۔

عبدالمالک آروی

نکسول

استعمال کرنے والے لوگ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے

اس لئے کہ

نکسول تمام مضر صحت اجزا سے پاک ہے اس میں جو اجزا استعمال کئے گئے ہیں وہ نہایت قیمتی ہیں، ان کے زندگی بخش خصائص حکیموں اور ڈاکٹروں کے نزدیک مسلم ہیں، یہی وجہ ہے کہ نکسول کو بوڑھے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور جوان بھی اور سب بقدر ظرف فایدہ اُٹھاتے ہیں، آپ بھی تجربہ کیجئے۔

قیمت
بڑی شیشی ------ آٹھ روپے
چھوٹی شیشی ------ تین روپے

نیش اینڈ ایلس
پراسپکٹ چیمبرس انیکس
فورٹ — بمبئی

برنجی شمعدان

ساشا، کوئی چیز کاغذ میں لپٹی ہوئی، بغل میں دبائے ڈاکٹر کوشلکان کے مکان کی طرف تیز قدموں سے جا رہا تھا۔ اس کی رفتار سے گھبراہٹ ضرور ظاہر ہوتی تھی، لیکن نہ اتنی کہ اس کے چہرہ و اطمینان کو دبا سکے۔

اس نے دروازہ کھٹ کھٹایا، ڈاکٹر نے اندر بلا لیا اور پوچھا "ساشا اب کیسے ہو، مگر دیکھو مجھے اچھی خبر سنانا"۔ (ہنستے ہوئے) "ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو"

ساشا نے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب، میں اب بالکل اچھا ہوں۔ اور میری ماں نے (بغل سے وہ چیز نکالتے ہوئے) یہ آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آپ نے میرے اکلوتے بچہ کی جان بچائی ہے، اس لئے معاوضہ تو میں غریب کیا دے سکتی ہوں لیکن اگر آپ نے یہ تحفہ قبول کر لیا تو بڑی مہربانی ہوگی"۔

ڈاکٹر (ہنستے ہوئے) :۔ "نہیں، ساشا، یہ تم کیا کہتے ہو، میں نے تو اپنا فرض ادا کیا، احسان کیسا؟ میری جگہ جو بھی ہوتا، وہی کرتا جو میں نے کیا"

ساشا : (متاثر ہو کر) "نہیں ڈاکٹر صاحب، آپ نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو دوسرا کبھی نہ کرتا، ہم آپ کے احسان سے اتنے دبے ہوئے ہیں کہ کبھی سر نہیں اٹھا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب یہ تحفہ تو آپ کو لینا ہی پڑے گا، ورنہ میری ماں کو بڑا رنج ہوگا، ہم لوگ بہت غریب ہیں اور غریب کو بڑی خوشی ہوتی ہے اگر کوئی بڑا آدمی اس کی پیش کی ہوئی چھوٹی چیز لے لیتا ہے"۔

ڈاکٹر : "ساشا، میں تمہارے اور تمہاری ماں کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا، لیکن جو کچھ تم لائے ہو اسے واپس لیجاؤ سمجھ لو کہ میں نے اسے لے لیا"

ساشا : (ملول ہو کر) ڈاکٹر صاحب، ایسا نہیں ہو سکتا، میری ماں کو سخت تکلیف ہوگی اور وہ مجھ پر بہت خفا ہوگی (کاغذ کھولتے ہوئے) یہ بہت پرانے زمانہ کی بنی ہوئی چیز ہے، ہمارے یہاں اسی قسم کی قدیم صناعی کی چیزوں کا کاروبار ہوتا چلا آیا ہے اور میرا باپ اس کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ فن کے قدر دانوں کے نزدیک یہ بڑی قیمتی و نادر چیز ہے"۔

یہ کہتے ہوئے ساشا نے اسے نکال کر میز پر رکھ دیا۔

یہ ایک برنجی شمعدان تھا، جس کی بیٹھک پر دو عورتیں کھڑی ہوئی شمعدان کے بالائی حصہ کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ یہ عورتیں بالکل برہنہ تھیں اور نہایت شوخی کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کو دیکھ کر اپنا سر کھجایا اور تکلف کے ساتھ گلا صاف کرتے ہوئے کہا: "ہاں، ہاں، یہ آرٹ کا بڑا اچھا

نمونہ ہے، لیکن — تم یہ تو دیکھو — کہ — کیا چیز ہے — کس قدر عریاں، کس قدر غیر مہذب!"

ساشا (حیرت سے) : "ڈاکٹر صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ذرا اس کی صناعی کو تو دیکھئے، یہ تو غور فرمائیے کہ بنانے والے نے ان تصویروں میں مسرت کی کتنی زبردست روح پھونکدی ہے۔ ان کو دیکھ لینے کے بعد انسان تھوڑی دیر کے لئے دنیا کے تمام غم بھلا سکتا ہے"

ڈاکٹر : "ہاں، یہ سب درست ہے، لیکن تم جانتے ہو کہ میں شادی شدہ انسان ہوں، عورتیں اور بچے سبھی میرے کمرے میں آتے جاتے رہتے ہیں اور میرے لئے یہ کیونکر ممکن —"

ساشا : "ڈاکٹر صاحب، اب آپ کچھ نہ کہئے، یہ آپ کو لینا ہی پڑے گا، میں اسے واپس تو نہیں لے جا سکتا، لیکن افسوس ہے کہ اس کا جوڑا ہمارے پاس نہیں ورنہ لطف تو یہ تھا کہ گلدان کے دونوں طرف ایک ایک شمعدان آپ کی میز پر رکھا ہوتا اور ہمارا یہ تحفہ مکمل ہو جاتا"

ساشا کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر دیر تک اس شمعدان کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا — "اس میں شک نہیں کہ یہ صناعی کا بڑا بے مثل نمونہ ہے اور اس کو پھینک دینا ظلم ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اپنے پاس رکھ بھی نہیں سکتا" وہ دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے اور آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ یہ تحفہ اوخوف وکیل کی نذر کر دینا چاہئے، اسنے مقدموں میں میری بڑی مدد کی ہے اور دوست ہونے کی حیثیت سے وہ روپیہ لیتا نہیں، یہ تحفہ اسی کو دینا چاہئے وہ ہے بھی اکیلا، اسے کوئی عذر نہ ہوگا"

ڈاکٹر نے فوراً کپڑے پہنے اور شمعدان کاغذ میں لپیٹ کر بغل میں دبایا اور چل دیا

ڈاکٹر : "اوخوف، میں تمہارا بڑا احسان مند ہوں، تم نے مقدموں میں میری بڑی مدد کی ہے، روپیہ کی صورت میں تم معاوضہ لیتے نہیں، اس لئے میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں"

یہ کہتے ہوئے، اس نے کاغذ علیحدہ کر کے شمعدان سامنے میز پر رکھ دیا اور بولا۔ "دیکھو کیسی نادر چیز ہے"۔

اوخوف، یہ شمعدان دیکھ کر خوش بہت خوش ہوا اور بولا کہ "واقعی بڑی بے نظیر صنعت ہے۔ لیکن میں اسے لے نہیں سکتا، میری ماں مجھ سے کبھی کبھی ملنے آتی ہے، میرے موکل روز ہی آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور ان سب کو جانے دو میرے نوکر دیکھیں گے تو کیا کہیں گے"

ڈاکٹر : "بائیں، یہ تم کیا کہہ رہے ہو، یہ تو غور کرو کہ بنانے والے نے ان تصویروں میں مسرت کی کتنی زبردست روح پھونکدی ہے۔ مجھے سخت تکلیف ہوگی، اگر تم نے اسے رد کر دیا"

یہ کہکر ڈاکٹر فوراً وہاں سے چلا آیا تاکہ اوخوف کو کچھ اور کہنے کا موقعہ نہ ملے۔

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد اوخوف نے اس شمعدان کو غور سے دیکھا اور دل ہی دل میں اس کی بہت تعریف کی اور سوچا کہ اس کو ضایع کر دینا تو بڑا ظلم ہے، کیوں نہ سوشکن کو دیدوں۔ وہ ایکٹر ہے اور اس کی بڑی قدر کرے گا۔

یہ سوچکر اوخوف فوراً اُٹھا اور سوشکن کو یہ شمعدان دے آیا۔ اُس دن سوشکن کے گھر میں بڑا ہنگامہ بپا رہا، اس کے ساتھی آتے تھے اور اس شمعدان کو دیکھ کر قہقہے لگاتے تھے۔ لیکن جب کوئی عورت اندر آنے کی اجازت چاہتی تو وہ اسے باہر ہی روکدیتا اور کہتا کہ "میں کپڑے پہن رہا ہوں، وہیں باہر انتظار کرو"

اس نے سوچا کہ یہ تو بڑی مصیبت ہے، میرے پاس اکثر عورتیں آتی رہتی ہیں اور وہ یہ شمعدان دیکھ کر کیا کہیں گی۔ وہ اسی فکر میں تھا کہ اس کے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ "تم اسے فروخت کیوں نہیں کر دیتے" یہاں ایک عورت ایسی ہی چیزوں کا کاروبار کرتی ہے، وہ اچھے دام دیکر خریدلے گی"

سوشکن اسی وقت یہ شمعدان لیکر اس کے پاس گیا اور اونے پونے بیچ آیا

دو دن بعد ——

ڈاکٹر کوشلکاف اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا، کسی دوا کی گولیاں بنانے میں مصروف تھا کہ دفعتاً دروازہ کھلا اور ساشا کوئی چیز کاغذ میں لپٹی ہوئی بغل میں لئے ہوئے تھا، اندر آیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا لیکن قبل اس کے کہ اُس سے آنے کی وجہ پوچھتا، ساشا نہایت خوشی کے لہجہ میں بیتابانہ بول اُٹھا۔ "ڈاکٹر میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں (کاغذ کھولتے ہوئے) آج اتفاق سے اُس شمعدان کا جوڑا بھی مل گیا اور میری ماں نے کہا کہ فوراً آپ کے پاس اسے بھی پہونچا دوں"۔

یہ کہکر ساشا نے شمعدان میز پر رکھدیا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور منہ کھول کر رہ گیا، وہ چاہتا تھا کہ کچھ کہے لیکن زبان سے کچھ نہ نکلتا تھا۔

(چیخوف)

مُغل لائن لمیٹڈ

لڑائی کے زمانہ میں ہمارے ان جہازوں کے اوقات جو سامان اور مسافروں کو عدن، جدّہ، پورٹ سوڈان، مصر اور ماریشس تک لیجاتے تھے، مجبوراً بے قاعدہ ہوگئے ہیں، لیکن صلح اور فتح کے بعد کمپنی کے تمام جہازوں کی آمد و رفت پھر باقاعدہ ہوجائے گی اور مسافروں اور سامان بھیجنے والوں کے لئے بدستور سابق پھر آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔

ٹرنر مارریسن اینڈ کو

مینجنگ ایجنٹس مغل لائن کمپنی

۱۶ - بنک اسٹریٹ بمبئی

تغزل میں جدید رجحانات

اور

فراق گورکھپوری

میرے ادبی مطالعہ کی ابتدا "گلکدہ" سے ہوتی ہے، جسے میں نے بارہا پڑھا اور اکثر جذبات میں ڈوب ڈوب کر پڑھا، اس کے بعد اصغر کا مطالعہ کیا اور کافی دلچسپی کے ساتھ، لیکن اسی زمانہ میں ایک شاعر کے کلام کا انتخاب نظر آیا جس کی لَے تو اصغر سے ملتی جلتی تھی لیکن نظر زیادہ وسیع تھی۔ مجھے تعجب انگیز مسرت کے ساتھ ان کے یہ اشعار یاد رہ گئے ؎

لرز رہی ہے فضا عالمِ محبت کی — کچھ اس طرح نگہِ یار شرمسار ہے آج

نمودِ شاہدِ دنیا تھی اک جاتی ہوئی دنیا — نگاہِ حسنِ عالم بھی نگاہِ واپسیں نکلی

قید کیا رہائی کیا ہے ہمیں میں سب عالم — چل پڑے تو صحرا ہے رُک گئے تو زنداں ہے

وبالِ دوش سے کچھ ہو چلے ہیں ان فضاؤں میں — مری پرواز میں حایل رہیں گے بال و پر کب تک

فریبِ رنگ و بو کھا کر چمن سے ہاتھ دھو بیٹھے — ترے وحشی تو کب کے لے اُڑے ہوتے گلستاں کو

یہ فراق کا کلام تھا جن سے ایک ادبی رابطہ تو اُسی دن قایم ہو گیا جب اول اول اُن کے یہ اشعار پڑھے، پھر آئے دن رسالوں میں چھپنے والا کلام اس رشتہ کو اور مضبوط بناتا رہا۔

فراق کا گھرانا اپنے مذہبی روایات کے اعتبار سے ہندو فلسفہ کا قایل تھا۔ والد کا پیشہ وکالت تھا لیکن فرصت کے اوقات شعر و سخن کے ذوق میں صرف کرتے۔ تخلص عبرت تھا اور مسلک شعر گوئی میں ایک طرف وہ داغ کے بھی معترف تھے اور دوسری طرف جدید رنگ کے بھی۔ اس لئے فراق کا ذہنی پس منظر سراسر مشرقی تھا لیکن ان کی تعلیم مغربی انداز پر ہوئی۔ گھر کے مذہبی ماحول نے اُنھیں سورداس، کبیر اور تلسی داس سے آشنا کرایا۔ خاندان کے ادبی ذوق نے میر، آتش، انیس، غالب، اور نظیر دماغ میں بسا دئے اور انگریزی تعلیم نے کیٹس، شیلے، بائرن، ورڈسورتھ اور شیکسپیر کے کارناموں سے روشناس کیا، اور اسی لئے ان کے یہاں ہندی زبان کی مٹھاس، اُردو فارسی کی رنگینی اور انگریزی کا تنوع نظر آتا ہے۔ اُنکے یہاں کلاسکی اور رومانی دونوں عناصر کا امتزاج ہے۔ اگر ان کی طبیعت میں ایک طرف اُردو ادب کا ماضی رچا ہوا ہے تو وہ دوسری طرف اپنے زمانہ کی روح اور مستقبل کی ضرورتوں سے بھی بے خبر نہیں۔ جہاں وہ میر و غالب کی ستایش کے جوہر رکھتے ہیں وہاں اُن کا نکھرا ہوا ذوق ترقی پسند شعراء کو بھی سراہتا ہے۔

اُردو غزل گوئی کو خواہ چار دور میں تقسیم کیجئے یا پانچ میں، لیکن میر سے لے کر داغ تک قریب قریب ایک ہی روح جلوہ گر ہے درمیان میں ایک طرف ناسخ اسکول نے جو تکلفات پیدا کئے تھے اُن کا کفارہ خود انھیں کے دبستان کے ایک شاعر تعشق لکھنوی نے جذباتی اسکول کی بنیاد ڈال کر ادا کر دیا، پھر جلال اور پیارے صاحب رشید کے توسط سے عزیز، نظر، صفی اور محشر نے وہ پچھلی روایات بالکل مٹا ہی دیں۔ دوسری طرف دلی میں غالب نے مسائلِ حیات کی جو تعمیر اُٹھائی تھی اور متانت کے جو خد و خال بنائے تھے انھیں داغ نے درہم و برہم کر دیا۔ "پیامِ یار" کے لکھنے والوں نے اوچھے جذبات، مبتذل خیالات اور بازاری زبان ہندوستان کے کونے کونے میں عام کر دی۔ داغ کے تیز ٹھرّے نے منھ کا مزہ کچھ ایسا بدل دیا کہ ہندوستان کے بڑے سے بڑے سنجیدہ فکر شاعر کو یا تو داغ کے رنگ میں آنا پڑا یا پھر وہ ایسے گمنام رہ گئے کہ آج آسی غازی پوری اور بیان و یزدانی میرٹھی کے نام سے بہت کم لوگ آشنا ہیں۔ شاد عظیم آبادی بھی اس زد میں آئے لیکن انھوں نے ایک طویل عمر پائی تھی اور داغ کے بعد ایک عرصے تک زندہ رہنا نصیب ہوا، اس لئے اپنی بہت کچھ عظمت ہم تک بچا لائے۔ اس طوفان ابتذال سے اُردو ادب کو جس چیز نے بچا لیا وہ وہی جذباتی اسکول تھا جو عزیز، نظر اور صفی کی قیادت میں "خدنگِ نظر" کے سہارے قایم ہوا تھا۔ یہ اسکول قدیم و جدید غزل کے درمیان مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں قدیم فنی خصوصیات اور جدید اسلوبی و معنوی وسعتیں موجود تھیں۔ اس حلقہ کا کام قریب قریب ۱۹۱۴ء میں ختم ہو گیا جہاں سے ہماری سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب رونما ہوا۔ ہمارے جذبات، خیالات اور عقاید سب ایک نئے رنگ میں رنگے گئے۔ کشمکشِ حیات کے عنوان بدل جانے کی وجہ سے ناول، ڈراما، افسانہ، نظم، غرضکہ تمام اصنافِ ادب میں ایک نیا کلچر اور نئی روح حلول کر گئی۔ زندگی کی سختیوں نے عشق کے چہ چلوں میں خود بخود سنجیدگی پیدا کر دی، حسن و عشق کے نفسیات نئے علوم کی روشنی میں نئی تابانیاں پا گئے۔ گل و بلبل کا پچھلا مفہوم بدل ان علامات کو سیاسی رُخ دیدئے گئے۔ شعراء کے نصب العین میں وسعت، نقطۂ نظر میں اجتماعیت اور لہجہ میں متانت آگئی اور غزل بھی اپنا چولا بدل کر نئے بھیس میں جلوہ گر ہوئی۔ اس انقلاب کے بعد خود "خدنگِ نظر" والوں نے بھی جو کچھ کہا وہ اُن کی پچھلی آوازوں سے بہت کچھ مختلف ہے چکبست، اقبال، حسرت، عزیز، یگانہ، اصغر اور فانی کی اس زمانے کی غزلیں دیکھئے تو آپ کو جا بجا انسانی کردار محبت کی نفسیات اور فلسفۂ حیات و کائنات کے سلجھانے کی کوشش ملے گی۔

۱۹۳۵ء سے ان تبدیلیوں میں اور جان پڑ گئی جبکہ اشتراکی تحریک زور پر آئی اور اس کے سال بھر بعد نئے ادب کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہاں سے زندگی اور ادب کے پچھلے زاوئے قطعاً بدل جاتے ہیں اور اصغر، جگر، صفی، عزیز، حسرت اور فانی کا کام قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔ اب اگر آپ غزل کو حسن و عشق کی تعبیر سے زیادہ وسعت نہ دینا چاہیں تو کہہ لیجئے کہ اس منزل پر آکر غزل ختم ہو گئی، لیکن اگر اس میں حیات و کائنات کے مسائل کا سمونا جُرم نہ ہو تو غزل اب بھی اپنی پوری عظمتوں کے ساتھ زندہ ہے۔ نئے ادب کی دست بُرد سے غزل کی دائمی مقبولیت کو جو شخص بچا کر آگے بڑھا لایا وہ اقبال تھا۔ اقبال نے اُردو غزل کو نئی قدریں عطا کیں اور پُرانی قدروں کو نئی صورت دیدی۔ غزلوں کی زبان، لہجہ اور آہنگ بدلا، نئے مفہوم اور متنوع خیالات کی گنجائشیں پیدا کیں۔ اسے راہبری اور بصیرت کا ذریعہ بنا کر دل و دماغ کو بیدار کیا اور بہ حیثیت مجموعی غزل کو تعمیری ادب کی شان دیدی۔

اقبال کے بعد جس شخص کے یہاں غزل میں تھوڑے بہت کچھ ایسے ہی احساسات ملتے ہیں وہ فراق ہیں یا ایک بھلک

مرزا یگانہ کے یہاں کسی وقت پائی جاتی تھی، مگر اب وہ بھی نہیں ہے۔ رہے جگر اور حسرت یہ لوگ دنیا کے مسایل سے منہ موڑ کر تلاشِ حسن میں کھو جانا ہی شاعری کا عنوان سمجھتے ہیں۔ لیکن فراق دنیا میں رہ کر دنیا کے مسائل سے منہ نہیں موڑتے بلکہ اپنی فکر سے زندگی کے نشیب و فراز سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یگانہ کے یہاں فنی احساس اور کلام کی پختگی کا خیال فراق سے زیادہ ہے لیکن ان کی دنیا فراق کے مقابلہ میں تنگ و محدود ہے۔ فراق عشق اور زندگی پر نئے گوشوں سے نظر ڈال رہے ہیں اور نئے اثرات کو سمجھ کر نئی حقیقتوں کی نقاب کشائی کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں خواہ نشاط کا بیان ہو یا غم و الم کی داستان کا فکر کا عنصر اور بصیرت کی روشنی دونوں جگہ پائی جاتی ہے۔ حضرت نیاز کے الفاظ میں "وہ شعر نہیں کہتے زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتے ہیں ---------- اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علٰحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔"

فراق کے کلام پر نقد و تبصرے سے قبل ہمیں چاہئے کہ شاعری کے متعلق خود فراق کا نظریہ تلاش کریں شاید ان کے یہ اشعار کچھ اس طرف اشارہ کر سکیں ؎

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا — اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے
کسی کے حسن کو آئی ہوئی ہو نیند سی جیسے — مرے اشعار میں انگڑائیاں لیتا اُٹھا کوئی
نسیمِ صبح سے بھی نرم رَو ہے گو غزل میری — دلوں میں کچھ دبی چنگاریاں بھڑکا ہی جاتی ہے
اسی عالم کے کچھ نقش و نگار اشعار ہیں میرے — جو پیدا ہو رہا ہے حق و باطل کے تصادم سے

ان اشعار کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فراق، شاعری کو حدیثِ حسن و عشق بھی سمجھتے ہیں اور حق و باطل کا بیان بھی۔ وہ اپنی غزل سے تخلیقِ حسن بھی کرتے ہیں اور دلوں کی دبی چنگاریاں بھی بھڑکاتے ہیں۔ وہ شاعری کو زندگی کی تلاش کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور ذوقِ جمال چونکہ حیاتِ انسانی ہی کا ایک شعبہ ہے اس لئے اُن کی غزل تنقیدِ حیات بھی ہے اور تفسیرِ جمال بھی۔ حیات اور کائنات ہم آہنگ چیزیں ہیں اس لئے فراق کے یہاں دونوں کی وسعتوں کا احساس، طہارت کا خیال اور دونوں سے انسانی اور فلسفیانہ لگاؤ پایا جاتا ہے۔

کائنات کی لامحدودیت کا احساس کبھی تو مناظرِ فطرت کے ایسے پہلو پیش کر کے پیدا کیا جاتا ہے جن میں خود ہی لامحدودیت ہو اور احساسات کا اس طرح ذکر کر کے وہ لامحدود سے معلوم ہونے لگیں۔

کائنات کی وسعت اور اُس کے اسرار سے متعلق چند شعر سنئے:

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے — اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے
ابھی جبینِ بشر منتظر سی ہو جیسے — کہ آدمی ابھی فطرت کا شاہکار نہیں

اس شعر سے حیات و کائنات کی طہارت اور وسعت کی تمنا ظاہر ہوتی ہے

جھپک رہی ہیں زمان و مکان کی بھی آنکھیں — مگر ہے قافلہ آمادۂ سحر پھر بھی

یعنی کائنات میں سفرِ انسانیت اتنا ہے کہ تھکن سی آگئی ہے

تیرہ بختی نہیں جانی دلِ سوزاں کی فراق — شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

اس ایک شعر میں کئی لاکھ سال کا حال آگیا ہے۔

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو — بیخودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو
نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم — صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو
کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا — کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو
یہ سکوتِ یاس یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا، — خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

اخیر کے دو اشعار کا موضوع یوں تو غم، حسرت اور ناکامی ہے مگر ان اشعار کا لہجہ ایسا ہے اور ان میں فضا کی کچھ ایسی وسعت پیدا کر دی گئی ہے کہ تنگ دلی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک لطیف سکون ملتا ہے اور چند شعر سنئے:

جولاں گہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں، — منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں
لطف و ستم، وفا جفا، یاس و امید، قرب و بعد — عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں،
اللہ رے اضطراب کہ جس اضطراب کا — موجِ فنا بھی اک اثرِ ناتمام ہو،
دلوں کو اب نہیں فردوسِ گمشدہ کی تلاش — وہ نشترِ غم فردا چلا دئے میں نے
دے رہا ہے عہدِ رفتہ آج بھی اپنا نشاں — آج بھی خاکسترِ ماضی سے اُٹھتا ہو دھواں
آج بھی تلووں سے مل جاتا ہو آنکھیں آسماں — آج بھی ہو نقشِ پا آئینہ دارِ کہکشاں،
اب گزرتا ہے وہاں سے زندگی کا کارواں — موت کی بھی جن صداؤں میں نکل آئے زباں
دیکھئے لَو دیتا جائے کب تک آدم کا گناہ — دیکھئے اُٹھتا ہے کب تک خاکِ آدم سے دھواں
اب بھی صبحیں مسکراتی ہیں نشاطِ عشق کی — اب بھی تیرے غم کی لَو ہے شمعِ محرابِ جہاں،

ان کے کلام میں بہ حیثیت مجموعی غم، زندگی، مناظرِ فطرت اور اخلاقیات کا ذکر جس انداز سے آیا ہے اگر اس کے پڑھنے میں تخیل اور وجدان سے کام لیا جائے تو پتہ چل سکتا ہے کہ شاعر کو کائنات کی طہارت کا کتنا احساس ہے۔

شاعری یا تو دُکھ کا بیان ہے یا نشاط کا اظہار یا پھر عمل کا پیغام۔ فراق کے یہاں غم و نشاط کا اظہار تو موجود ہے لیکن پیامِ عمل کا فقدان ہے جس کے بجائے وہ درکِ عمل کے قایل ہیں۔ اقبال چونکہ اپنے مذہبی نظریے کے مطابق انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتے تھے اس لئے اُس کی اصلاح کی طرف مایل ہو گئے اور انسانی جد و جہد پر زور دیا برخلاف اُن کے فراق پر بودھ اور ہندو مذہب کا اثر ہے جو کل مخلوقات کو ایک نظر سے دیکھنے کے قایل ہیں، اس لئے فراق ٹھیراؤ چاہتے ہیں اور انسانی عظمت بجائے عمل کے خیال میں سمجھتے ہیں۔ وہ ایک غیر مشخص طاقت کی کارفرمائی کے قایل ہیں جو خود بھی کائنات کی گیند کو لڑھکاتی رہتی ہے اس لئے انسانی جد و جہد لایعنی ہے۔ اسی عقیدہ کی وجہ سے فراق کی نیچرل شاعری اقبال کی نیچرل شاعری سے مختلف ہے۔ اقبال کے یہاں نیچر کی جگمگاہٹوں کو پس منظر کے طور پر لے کر انسانی حرکت کا ایک ذریعہ بنایا گیا ہو اُنھوں نے مناظر سے اپنے نظریئے کی وضاحت کا کام لیا ہے برخلاف اس کے فراق کے یہاں آگ، ہوا، صبح و شام، ستارے اور دریا کارآمد نہیں، پاک مانے گئے ہیں۔ اقبال صبح کے حُسن کو خدا کا کارنامہ سمجھتے ہیں اور اُس کی پرستش کو ایک طرح کا نشہ بتاتے ہیں۔ فراق کا مذہبی تصور صبح کو صبح کا جلوہ سمجھ کر پوجتا ہے۔ اُن کے لئے فطرت ایک طرح کا روحانی مکان ہے

جس سے الگ ہو جانے کا وہ کوئی احساس نہیں رکھتے۔ اُن کے یہاں نیچر کے ساتھ ایک خونی رشتہ ہے وہ مادیت اور روحانیت کی وحدت کے قایل ہیں۔ ان کی نظر میں روح مادہ اور مادہ روح ہے۔ اقبال حرکت کے قایل ہیں اور چین، عرب اور ہندوستان سے بڑھکر ایک لامکانی دنیا تک پہونچنا چاہتے ہیں۔ فراق اگر بڑھنا بھی چاہتے ہیں تو نئی منزل کو وطن بنانے کی فکر ہے اور یہ وطن بنانا ٹھہرنا نہیں بلکہ دور جانا ہے ؎

نئی منزلوں کو سکونِ وطن دے ٹھہرنا نہیں ہے یہ ہے دور جانا

فراق کے یہاں غم و نشاط کے بیانات بڑی افراط کے ساتھ آئے ہیں لیکن ان میں افسردگی و اضمحلال نہیں بلکہ ایک طرح کی چمک ہے۔ انسان میں جب اعتدال کی کمی ہوتی ہے تو اُس کی کوششوں میں المیہ کا رنگ آجاتا ہے۔ اپنی ناکامیوں سے شدید اثرات لینا اچھی بات نہیں۔ جن لوگوں کو اس کا احساس ہے وہ غم میں اپنے حواس باقی رکھ کر اپنی ناکامیوں سے ایک زندہ یا شاندار سکون پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیکسپیر کے ناپختہ دور کی تصنیف "رومیو جولیٹ" میں غم بہت کچا ہے جو بڑی حد تک فانی سے ملتا جلتا ہے۔ رفتہ رفتہ جب شیکسپیر کے خیالات میں پختگی اور نظر میں گہرائی آئی تو دوسرے دور کی تصانیف آتھیلو اور ہملیٹ میں وہ انداز بالکل بدل گیا اور آخری حصۂ عمر میں ٹو سمبلین، ٹیمپیسٹ، اور ونٹرس ٹیل کے اندر ٹریجڈی میں ایک نشاطی روح آجاتی ہے۔ فراق اپنے بیانِ غم میں بڑی حد تک شیکسپیر سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کا غم فانی کی طرح نہ کچا ہے اور نہ شخصی۔ اس میں محبوب کے مظالم اور بیوفاؤں سے مظلومیت نہیں آئی بلکہ یہاں غم پر قسمت کا سایہ معلوم ہوتا ہے فراق غم وجود کے قایل ہیں اُن کا خیال ہے کہ ماسوا میں سوز کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے اور فضاؤں میں ایک درد حل کیا ہوا ہے مظاہرِ فطرت بیک وقت انبساط بھی ہیں اور سوز و گداز بھی۔ فانی کے غم میں ایک طرح کی خود رحمی (Self pity) ہے جو سرتاپا "میں" سے بھرا ہوا ہے اور جس میں دُنیا کے غم کا کوئی احساس نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تخلیقِ کائنات کا مقصد یہ گردانتے ہیں کہ اُن کا غم سُنا جائے اور اُن کے آنسو پونچھے جائیں۔ فراق کے یہاں نہ ذاتی احساسِ غم ہے نہ ذاتی ناکامیوں کا رونا۔ انسانی زندگی میں غم کا ایک عنصر موجود ہے جو ترقی کر کے وجود کی ایک ایسی صفت بن جاتا ہے جو حقیقت سے جدا نہیں کیجا سکتی یہی آفاقی احساسِ الم فراق کے یہاں ملتا ہے۔ فراق کے غم میں رومانیت، آفاقیت، فضائیت اور ماورائیت سبھی کچھ ہے مثلاً

پھر ہیں وہی اُداسیاں پھر وہی سونی کائنات اہلِ طرب کی محفلیں رنگ جما کے رہ گئیں،

اُداسی وہ چھائی ہے باغِ جہاں پر ہواؤں کا چہرہ بھی اُترا ہوا ہے

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

اس آخری شعر میں اور ع "زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا" میں بڑا فرق ہے۔

فراق کے یہاں غم میں بھی ایک طرح کا مفکرانہ عنصر ملتا ہے ؎

نیند آچلی ہے انجمِ شامِ ابد کو بھی آنکھ اہلِ انتظار کی اب تک لگی نہیں

فراق اپنے غموں کو بھلا کے کہتا تھا سدا بہار ہے دنیا سدا سہاگ ہے تو

فراق کی شاعری میں غم کچھ ایسی لطافتوں کے ساتھ سمویا گیا ہے کہ ہر جگہ ایک کسک سی محسوس ہوتی ہے۔ ہر شعر پڑھ کر ایک میٹھا میٹھا درد سا معلوم ہوتا ہے۔ حضرت نیاز اسے محبت کی مجبوری اور مایوسی سے تعبیر فرماتے ہیں جو بقدرِ

مشترک فراق کے ہر شعر میں موجود ہے۔ مثلاً :

جو تیرے گیسوئے پرخم سے کھیل بھی نہ سکیں اُن انگلیوں سے ستاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

اس شعر میں ادعائے فخر اور ایک بجھی ہوئی تمنا دونوں سے لطیف سوز ٹپکتا ہے۔

نیرنگیِ امیدِ کرم اُن سے پوچھئے جن کو جفائے یار کا بھی آسرا نہیں

ہندو روایات میں موت کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے فراق کے یہاں آپ موت کا ذکر بہت کم پائیں گے، وہ فانی و عزیز کی طرح نہ اس کے تذکرہ سے درد پیدا کرتے ہیں اور نہ کسی آیندہ پرسکون زندگی کا لالچ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے یہاں حیات کی اہمیت موت سے بہت زیادہ ہے ؎

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

نشاط زندگی کا ایک قیمتی اور قابلِ احترام جزو ہے۔ نشاط کا احساس تخیل کے ذریعہ سے کرنا انسان کی خوش نصیبی ہی نہیں فرض بھی ہے۔ یہ کہنے سے کام نہیں چلتا کہ فانی غریب کی زندگی میں خوشی کے مواقع ہی نہیں آئے اس لئے سوائے آہ کے اُن کی زبان سے نشاط کی آوازیں کہاں سے آتیں۔ جس شخص نے ۶۲ سال نہایت باعزت زندگی گزاری اور جسے دوستوں نے اتنا چاہا اُس کی زبان پر نشاط کا ذکر نہ آنا کتنے تعجب کی بات ہے۔ نشاط کا یہ مفہوم نہیں کہ آپ رقص و سرود پر آمادہ موجائیں۔ نہ سطحی ہنسی ہنسنے کو نشاط کہتے ہیں نہ اُس قہقہے کو نشاط سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس سے کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ سنجیدگی، خلوص، نیکی اور شرافت، نشاط سے ہم آہنگ ہیں۔ فراق نے ضرورت سمجھی کہ کائنات کے اس عنصر سے اپنے تخیل کو اجنبی نہ رکھیں بلکہ اس کا احترام کریں۔ وہ نشاط زندگی کی حقیقت کے قایل ہیں ؎

نشاطِ زندگی ہے اک حقیقت باوجود اس کے کہ ہر عشرتکدہ آخر کو غمخانہ نکلتا ہے

ذیل کے اشعار میں غم و نشاط کو پہلو بہ پہلو پیش کیا ہے ؎

زندگی کا زندگی ہونا قیامت ہے فراق اُف یہ دردِ بے نہایت یہ نشاطِ بیکراں

نشاطِ حسنِ ازل کو بھی وجد آجاتا دُکھی ہوئی ابھی اتنی رگِ حیات نہیں

نکل رہے ہیں ہزاروں نشاط کے پہلو ابھی فسانۂ غم کو تمام ہونا ہے

ریاض دہر میں بوئے نشاط پھیل گئی نہالِ غم کے بھی کیا کیا گل و ثمر نکلے

کچھ لوگ اپنے بیان میں نشاط کی لہر ساقی، بہار اور بادہ و ساغر سے پیدا کرتے ہیں۔ یہ سستے قسم کا نشاط یا خمریاتی عنصر تلاش کرنے سے فراق کے یہاں بھی ملجائے گا لیکن اس سے عام اُمیدوں کی تشفی نہیں ہوسکے گی۔

غم و نشاط کے تصورات میں اعتدال کی وجہ سے فراق کے یہاں جلی کٹی باتیں نہیں ہیں۔ فانی اپنے غم میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ تفسیرِ حسن کے بجائے محبوب سے شکایتیں کرنے لگتے ہیں۔ حسرت کے یہاں یہ بے اعتدالی نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی محبت بلند ہے جس میں خود فراموشانہ ربودگی کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی شاعری مجاز کے جذبات سے شروع ہوکر اُس کے تمام اخلاقی پہلوؤں کو دکھاتی ہوئی تسلیم و رضا پر ختم ہوتی ہے۔ فراق کے عشق میں شاید یہ شان اور یہ بلندی نہ ہو لیکن اُن کے یہاں معشوق کے احترام کا کچھ ایسا ہی جذبہ ملتا ہے۔ وہ محبوب کو انبساطِ زندگی کی مثال سمجھتے ہیں اس لئے

اُس کی شکایتوں سے گریز کرتے ہیں۔ محبوب کا جو احترام ان کے یہاں موجود ہے وہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں بہت کم نظر آتا ہے، ان کے اشعار میں محبوب کی کہیں ایسی شکایت نہیں ملتی جو اُس کے کردار اور فطرت کو بُرا بتائے یا بُری روشنی میں پیش کرے۔ شکایتیں ہیں لیکن اُن میں محبوب کی نرمی اور نیکی اور انسانیت کا وہ اعتراف ہے جو ایک نہایت خوشگوار اثر ڈالنے کے علاوہ محبوب ہی نہیں بلکہ انسانیت کی طرف ایک بہت شریفانہ رجحان پیدا کر دیتا ہے اور ہماری تہذیبِ نفس میں معاون ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جس لہجہ میں شاعر نے محبوب کو مخاطب کیا ہے، جس انداز میں اس کا ذکر کیا ہے وہ جذبۂ محبت، احساس انسانیت اور لطیف تفکر کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتا ہے جو عام طور پر عشقیہ شاعری میں ہمیں نہیں ملتا اس نکتہ کی وضاحت کے لئے چند اشعار دیکھئے ؎

نگاہِ یار کچھ ایسی پھری حرماں نصیبوں سے
کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے

یہی ہوا کہ ترے غمزدوں پہ کچھ نہ ہوا،
جو آئے لفظ و بیاں میں وہ واردات نہیں

رقیب پر بھی ستم ہیں مگر ستم کیا ہیں
کہ جورِ حُسن بھی مردم شناس ہوتا ہے

اہلِ غم کو تیرا پیمانِ وفا،
یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں

زندگی اے دوست غم کا نام ہے
یہ تو شاید شکوۂ بیجا نہیں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تو نے تو خیر بے وفائی کی

کہاں اتنی خبر، عمرِ محبت کس طرح گزری
ترا ہی درد تھا دل میں جہاں تک یاد آتا ہے

حال ہی میں فراق خطرناک طور پر بیمار ہو گئے ایک ہفتہ سے زیادہ غشی طاری رہی۔ اسپتال میں جب ہوش آیا اُس زمانہ کی ایک نظم "شامِ عیادت" کے چند شعر دیکھئے

فضائے اسپتال ہے کہ رنگ و بو کی کروٹیں
ترے جمالِ لالہ گوں کی داستاں لئے ہوئے

جگانے والے نغمۂ سحر لبوں پہ موجزن
نگاہیں نیند لانے والی لوریاں لئے ہوئے

مجھے جگا رہا ہے موت کی غنودگی سے کون
نگاہوں میں سہاگ رات کا سماں لئے ہوئے

جبینِ نور جس پہ پڑ رہی ہے نرم چھوٹ سی
خود اپنی جگمگاہٹوں کی کہکشاں لئے ہوئے

لبوں سے پنکھڑی گلاب کی حیات مانگے ہے
کنول سی آنکھ سو نگاہِ مہرباں لئے ہوئے

تبسمِ سحر ہے اسپتال کی اُداس شام
یہ کون آ گیا نشاطِ بیکراں لئے ہوئے

تو آ گیا! تو آ گیا! یہ شام جگمگا اُٹھی
بہار لہلہا اُٹھی شمیمِ جاں لئے ہوئے

یہ زلفِ خم بہ خم شمیمِ مست سے دھواں دھواں
یہ رُخ چمن چمن بہارِ جاوداں لئے ہوئے

کچھ اور سنئے ؎

ترے خیال میں تیری جفا شریک نہیں
بہت بھلا کے تجھے یاد کر سکا ہوں میں

جو ترے دیار میں آ رہے، ارے کیسے تجھ سے جدا رہے
تجھے اپنا کچھ تو پتہ رہے یہ نہ پوچھ ہم سے کہاں کے ہیں

اسے پڑھ کر بے ساختہ میر کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

وجہِ بیگانگی نہیں معلوم تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

فراق کا ایک اور شعر سنئے :

پتے نہ دے تو یار کو ہمارے حالِ زار کے کہ اے نگاہِ یار ہم بھی ہیں اُسی دیار کے

شعر میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ نگاہِ یار سے یہ التجا کی گئی ہے کہ اگرچہ تو ہمارا حالِ زار دیکھ رہی ہے لیکن یار کو اس کا پتہ نہ دینا یار کا تغافلِ پنہاں قایم رہے (حسن کی سرمستی کی طرف کتنا لطیف و نازک کنایہ ہے یعنی حُسن دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا) ایسی التجا کیوں کی گئی ؟ اس کی بہت نازک وجہ بیان کی گئی ہے "کہ اے نگاہِ یار ہم بھی ہیں اُسی دیار کے" اپنے ہم وطن کے سامنے اپنا حالِ زار کوئی پیش کرنا نہیں چاہتا - پردیس میں بھیک مانگنا برداشت کیا جا سکتا ہے، اپنے وطن میں نہیں۔ محبوب سے جس لگاؤ اور جس پاکیزہ تعلق کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے وہ اس جذبے کے مہذب ہونے کا ایک لاجواب ثبوت ہے۔

اقبال کے نزدیک آرٹ کی اعلیٰ قدر و قیمت یہ ہے کہ "روحانی اور اخلاقی اقدار کا احساس و توازن ادراکِ حُسن کے ذریعہ پیدا ہو۔ آرٹ احساسات و کیفیاتِ شعوری کی ساری منتشر قوتوں کو شخصیت کی گہرائیوں میں سمو کر وجدانی وحدت کی صورت میں ظاہر کرے" یہ تعریف فراق کی شاعری کے متعلق بھی اتنی صحیح ہے کہ کسی شک کی گنجایش نہیں۔ ٹیگور کی طرح ان کی شاعری کا نقطۂ آغاز بھی جمال ہی ہے، جس میں زمانے کے ساتھ ساتھ جلالی عنصر آتا گیا ہے اور اب انکی نظر حیات و کائنات کے بہت سے رموز سلجھاتی ہوئی نظر آتی ہے - ان کے ایک ہاتھ میں حُسن اور دوسرے میں زندگی کا دامن ہے۔ وہ صرف حسن آفرین ہی نہیں معنی آفریں بھی ہیں۔ وہ صرف حسن و عشق اور ہجر و وصال کے ذکر اذکار ہی سے شعر کی تعمیر نہیں کرتے بلکہ ایک بصیرت بھی دیتے ہیں - یہ بصیرت کسی پیغامِ عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارے خیالات میں ایک تحیر پیدا کر کے ہمیں اسرار کشائی کا شوق دلایا جاتا ہے جس کا انجام بصیرت ہے۔ بعض اساتذہ کے چند شعر سنئے :

(نسیم لکھنوی) شمع نے سر پہ رکھی آگ قسم کھانے کو بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو

(غالب) داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

(داغ) رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں اِدھر آتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ جاتا ہے

(میر فصاحت لکھنوی) مجھ میں اور شمع میں ہوتی تھیں یہ باتیں شبِ ہجر آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے

مندرجۂ بالا میں سے تین شعروں میں زبان و خیال کی لطافتوں سے ماوراء کوئی اور حُسن نہیں غالب نے البتہ اپنے شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا ایک موثر ثبوت دیا ہے۔ اب فراق کا ایک شعر دیکھئے :

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراق شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

اس شعر میں فطرت کے بعض رموز چھپے ہوئے ہیں جن کے احساس سے ہم میں ایک تحیر پیدا ہوتا ہے جو بصیرت کی جان ہے شعر میں یہ کیفیت محدود میں لامحدود کی جھلک دیدینے سے پیدا ہو جاتی ہے اور یہ فراق کے آرٹ کی خصوصیت ہے۔ اسی قسم کے اور دو شعر سنئے :

دیکھئے کب اس نظامِ زندگی کی صبح ہو آسمانوں کو بھی جیسے آ رہی ہو نیند سی

موت اک گیت رات گاتی تھی زندگی جھوم جھوم جاتی تھی

فراق کی فنی خصوصیات میں سے جو چیز اُنھیں اپنے معاصرین میں ممتاز کر دیتی ہے وہ اُن کا اجتماع ضدین یا اتحاد ضدین کا اہتمام ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے دو ضدیں بیک وقت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ سفیدی نام ہے سیاہی کے عدم کا، اس لئے ایک چیز یا تو سفید ہوگی یا پھر سیاہ وہ بیک وقت سیاہ و سفید نہیں ہو سکتی۔ کون اور فساد، عدم اور وجود ایک تصویر کے دو رُخ ہیں جو لازم و ملزوم کہے جا سکتے ہیں لیکن متحد نہیں ہو سکتے۔ اب یہ شاعر کا کمالِ احساس ہے کہ وہ عالمِ وجود میں عدم کی جھلک دیکھ پائے یا کون و مکان میں فساد کا اشارہ پا جائے اور ان اضداد اور ان اختلافات کو اس حُسن کے ساتھ ترتیب دے کہ ان کا اتحاد مشکل نہ معلوم ہو۔ فراق نے اپنی اس خصوصیت کی صراحت اس طرح کی ہے "نفرت و محبت، حسن و قبح کا شدید ترین احساس کرتے ہوئے حیات و کائنات پر میرا ایمان قایم رہا۔ کفر اور ایمان دونوں لحاظ سے وحدتِ وجود کا قایل رہا پھر تلخی، ناکامی، حسرتوں کا خون ہونا اور جدلیت پذیر وحدت کا احساس اتحادِ ضدین کی صفت میرے وجدان اور میری شاعری میں کیوں نہ پیدا کر دیتی۔ مجھے زخم ہی کو مرہم بنانا تھا پھر کیا کرتا" فراق کی اس خصوصیت سے متعلق چند شعر دیکھئے:

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل
کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں، دراز بھی ہے

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مُسکرا دیا

زہے یہ عالمِ راز و نیازِ حُسن ترا
خموش یوں ہے کوئی جیسے بات کرتا ہو

عشق کے اضطراب میں پہلے یہ نرمیاں نہ تھیں
سوزِ نہاں کی شکل میں کون یہ مسکرا دیا

دل دُکھ کے رہ گیا یہ الگ بات ہے مگر
ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے

بچی بچی سی وہ نظر، ملی ملی سی وہ نظر
یہ فاصلے نئے نئے، یہ قربتیں نئی نئی،

ایک سرے سے بزمِ ناز خلوتِ راز ہو گئی
شکوۂ بر ملا بھی آج شکوۂ بر ملا نہیں

فراق کے آرٹ کی تیسری خصوصیت ان کی رمزیت ہے۔ یہ رمزیت جو غالب کے "بادہ و ساغر" میں اور رومی کے یہاں "حدیثِ دیگراں" میں چھپی ہوئی ہے چند الفاظ میں بڑے سے بڑے مفہوم کو ادا کر دیتی ہے۔ اس سے بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور خیالات میں بے پایانی آجاتی ہے۔ کسی مانوس منظر یا احساس یا کسی سامنے کی چیز میں وہ لطافت پانا جو عام طور پر محسوس نہیں ہوتی اور اس میں تعجب پیدا کرنے کی صفت پانا رمزیت ہے رمزیت کا کمال کبھی تو اصطلاحات کے پردے میں دکھایا جاتا ہے اور کبھی کلی کو دیکھ کر یہ محسوس کر کے کہ کوئی مسکرا رہا ہے۔ فراق کے یہاں بادہ و ساغر، جنوں و صحرا، اور قفس و آشیاں والی رمزیت بھی ہے اور "غنچہ و تبسم" سے بھی یہ کام لیا گیا ہے:

آسمانوں کو نیند آتی ہے
کون یہ لے رہا ہے انگڑائی

نگاہِ ناز میں صبحِ ازل کی کیفیت!
ارے یہ کب کے فسانے سُنائے جاتے ہیں

حُسن کی نرمیوں نے لَو دی ہے
مُسکرانا ترا ہے یا مجھے

فراق کی رمزیت اکثر اُس تجربے تک پہونچاتی ہے جسے گمشدگی کہتے ہیں۔ گمشدگی کے معنی ہیں کسی تصور یا احساس میں کھو جانا یا کسی منظر کو اپنے اوپر حاوی کر لینا۔

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا یہ رات ! یاد آرہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات
ہے شامِ ہجر، گوش بر آواز ہوں فراق لرزاں ہیں کچھ سکوت فضا میں پیام سے

فراق کے آرٹ کی چوتھی خصوصیت ان کے تحت الشعوری نفسیات کا بیان ہے۔ ان کے اکثر اشعار ایسے معنی خیز ہوتے ہیں کہ جن میں انسانی فطرت کے نفسیاتی اشارے اور جذباتی اشارے اور جذباتی کنائے چھپے ہوئے ملتے ہیں۔ کلام سنکر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نکتہ جانتے تو ہم بھی تھے لیکن کبھی اس طرف خیال نہ گیا تھا ؎

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں، اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
تری یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں، محبت ہے شاید تجھے بھول جانا
قول و قرارِ حسن بھی خواب و خیال ہو گئے جو نہ کہا تھا حسن نے عشق کو بھولتا نہیں
پھر دل پہ ہے نگاہ کسی کی رُکی رُکی کچھ جیسے کوئی یاد دلاتا ہو آج پھر

مندرجہ ذیل اشعار محبوب کے تحت الشعوری کردار کو کس خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں :

میں جب پڑھتا تھا وہ اشعار جن میں تھا بیاں تیرا نمایاں تھا ترے چہرے پہ اک جذبہ رقابت کا
کھلیں نہ حُسن کی فطرت کے راز عاشق پر برت خلوص بھی جھوٹی قسم بھی کھائے جا

فراق تحت الشعوری خیالات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی حقایق کی ترجمانی بھی بڑی خوبی سے کر جاتے ہیں مثلاً:

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں
نہ گئیں سرگرانیاں تیری آہ یہ مہربانیاں تیری

فراق کی شاعری میں سب سے زیادہ زور لہجہ پر دیا گیا ہے اس کے بعد مفہوم اور اخیر میں زباں کا نمبر آتا ہے، اُردو شعرا میں لہجہ کی گھلاوٹ اور نرمی میں میرؔ کا جواب نہیں، وہ اس انداز سے شعر کہتے ہیں جیسے ماں بچے کو چمکارتی ہے یا بہن بھائی کو پکارتی ہے۔ ان کے اشعار میں تُو، بھی، ہی، سو، کے استعمال پر غور کیجئے تو آپ کو اِن کی تہ میں چھپے ہوئے نرم انداز بیان کا بہت کچھ راز مل جائے گا۔

لہجہ کی گھلاوٹ اگر میرؔ کے بعد دیکھنی ہو تو زہرِ عشق کا وصیت نامہ دیکھئے۔ جدید غزل گویوں میں عزیزؔ لکھنوی کا لہجہ بہت کچھ میرؔ سے مماثل تھا ؎

کبھی حوصلے دل کے ہم بھی نکالیں اِدھر آؤ تم کو گلے سے لگا لیں،

عزیزؔ کی طرح فراق کا لہجہ بھی بڑی حد تک میرؔ سے ہم آہنگ ہے جس میں وہی موسیقی اور وہی پیار شامل ہے جو محبوب سے ہم آہنگی، ٹھیٹھ انسانی محبت، اور نرم و لطیف تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کبھی محبوب کو پکار کر کبھی ستارے چاند اور ہوا کو آواز دے کر یہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں :-

نرم فضا کی کروٹیں دل کو دکھا کے رہ گئیں ٹھنڈی ہوائیں بھی تری یاد دلا کے رہ گئیں

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

فراق کبھی آواز کے مجموعی صوتی عناصر سے لہجہ میں ایک طرح کی موسیقیت پیدا کر دیتے ہیں مثلاً:

تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر — تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی یہ رات
فراق ایسے میں کیوں ڈبڈبا سی آتی ہے آنکھ — ہوا میں نرم لچک ہے فضا میں ٹھنڈک ہے
رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی، — وہ پَو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

فراق کے کلام میں موسیقیت اور لہجے کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی ٹھنڈک اور ایک قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے جسکی وجہ خود فراق یہ بتاتے ہیں کہ ان کے کلام کا کثیر حصّہ رات کے وقت کہا گیا ہے

اب فراق کی زبان اور انداز بیان کو لیجئے۔ حضرت جگر مراد آبادی نے ایک صحبت میں معترضانہ انداز میں فرمایا تھا کہ "فراق کے کلام میں مختلف اسٹائل ہیں" فراق کے اسٹائل میں جو تنوع ہے وہ ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ اُن کا عیب نہیں حُسن ہے۔ انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ greatest poet is varied بڑے شاعر کے یہاں ہمیشہ تنوع ہوتا ہے مثلاً غالب ایک جگہ کہتے ہیں:

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اور پھر دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز — دُعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

لیکن غالب اپنے اسٹائل کی روح کو کبھی نہیں بھولتے۔ اسی طرح فراق کبھی تو نظیر اکبر آبادی کی طرح بیحد سادہ شعر کہتے ہیں جیسے:

دھیرے دھیرے ڈورے ڈال — چپکے چپکے حُسن کو پھانس
آج تو درد ہجر بھی کم ہے — آج تو کوئی آیا ہوتا،
کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر — بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

اور کبھی فانی و عزیز کی طرح رچ کر شعر کہتے ہیں جیسے:

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بقدم — رُکے رُکے سے کچھ آنسو رُکی رُکی سی ہنسی
یہ رنگِ رُخ تھا اُٹھائی ہو جب نگاہ اُسنے — شراب جیسے چھلکتے چھلکتے رہ جائے
لبِ نگار ہے یا نغمۂ بہار کی لَو — سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطلبِ رنگیں
نگاہِ یار کب تک یہ فریبِ ہمت افزائی — یہیں تک عشق مشکل تھا یہیں سے عشق آساں ہے

اس تنوع کی وجہ فراق کی نظر کی وسعت اور مطالعہ کی کثرت ہے جس نے اُن کے دماغ میں مختلف اسٹائلوں کے نقوش جما دئے ہیں، ان کے تمام کلام میں مغربی ادب کی ایک گونج سمائی ہوئی ہے جس نے اُن کے تخیل اور انداز بیان دونوں میں تنوع پیدا کر دیا ہے، انداز بیان کا تنوع اگر ایک ہی غزل میں ہو تو آپ عیب کہہ سکتے ہیں لیکن فراق کے یہاں ہر ایک غزل میں تو انداز بیان کا اتحاد ہے یہ اختلاف یا تنوع مختلف غزلوں میں ضرور آگیا ہے۔ دس میں سے سات غزلیں ایک اسٹائل میں ہیں اور باقی تین مختلف انداز میں لیکن پھر بھی شاعر کی اسپرٹ ہر جگہ ایک رہتی ہے اس لئے یہ کوئی عیب نہیں حسن ہے۔ ہر بڑا شاعر اپنے اندازِ بیان میں تنوع ہوتا ہی ہے۔ شیکسپیر کو لیجئے تو آپ کو طربیہ میں جو انداز ملے گا وہ المیہ میں نہ پائیے گا

لیکن شیکسپیئر کی اسپرٹ ہر جگہ ایک رہتی ہے اس لئے وہ عیب نہیں حُسن ہے۔ فراقؔ کے معاصرین مرکزی انداز احساس کے شکار ہیں اس لئے اُن کے اسٹائل میں تنوع نہیں آسکتا مثال کے طور پر جگرؔ کو لیجئے وہ اول سے آخر تک ہر جگہ جگر ہی رہتے ہیں لیکن فراقؔ میں یہ یک سُراپن نہیں۔ وہ اپنے رنگ کے خارجی خدوخال کے شکار نہیں۔ پروفیسر آلِ احمد سرورؔ کا خیال ہے کہ ان کی زبان اُکھڑی اُکھڑی ہے فراقؔ کے یہاں یہ بات اندازِ تفکر کی وجہ سے نظر آتی ہے۔ بات سوچی ہی اس انداز سے گئی ہے جس طرح بیان ہوئی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کا خیال ہے کہ "فراقؔ ابھی ناپختہ ہیں"۔ مجھے اس خیال سے اختلاف ہے۔ رطب و یابس تو ہر شخص کے یہاں ہوتا ہے لیکن ہم کوئی قطعی رائے اس کثرت پر قایم کرتے ہیں جو اس کے کلام میں موجود ہو۔

شاعر کے اہم ترین کارناموں میں ایک چیز اُس کی "جملہ سازی" (Phrase - making) ہے۔ فراقؔ کے یہاں اس خصوصیت کے متعدد اشعار تلاش کئے جاسکتے ہیں علاوہ ازیں وہ اکثر الفاظ بھی ایسے اچھوتے استعمال کرتے ہیں جو خود اپنے اندر موسیقیت لئے ہوئے ہوں۔

تراکیب کی ساخت میں بھی انھیں خاصہ ملکہ حاصل ہے۔ فراقؔ کے اس قسم کے اشعار میں شاید غالبؔ بھی اصلاح نہ دے سکتے۔ ان میں فراقؔ کی آواز غالبؔ سے جا ملتی ہے لیکن یہ کسی کا تتبع نہیں بلکہ فراقؔ کی اپنی چیز ہے اور خود انھیں کے رنگ میں ہے ؎

گزر گیا تو جدھر سے چراغ جل اُٹھے — فروغِ راہگذر نرم گامیاں تیری
نظر نظر سے محبت کے پھول کھلتے ہیں — شمیمِ گلشنِ دل خوش نگاہیاں تیری
سرشکِ حسن، ریاضِ جہاں و باغِ بہشت — کہاں کہاں نہ ہوئیں لالہ کاریاں تیری

فراقؔ کی ان تمام خصوصیات کو نظر میں رکھنے کے بعد ان کے معائب کی طرف مشکل سے نظر اُٹھتی ہے لیکن پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی بسیار گوئی اچھی چیز نہیں۔ مانا کہ ان کی طبیعت رسا ہے اور طبیعت جب ایک زمین کو پکڑ لیتی ہے تو چھوڑنا نہیں چاہتی لیکن پھر بھی انھیں تلخیص و انتخاب سے کام لینا چاہئے ورنہ مجھے ڈر ہے کہ یہ چیز آیندہ چل کر اُنکے مرتبۂ شاعری کو صدمہ پہونچائے گی۔

سید صفدر حسین ام۔ اے

اندازے

اُردو کے کچھ مشہور شعرا پر فراقؔ گورکھپوری کے سیر حاصل مقالے۔ اُردو نثر میں قوت اظہار کی نادر مثال، ہر فقرہ چونکا دینے والا اور دعوتِ فکر و تامل دینے والا۔ جمالیاتی تنقید کا نایاب نمونہ۔ پونے تین سو صفحات، مجلد۔ قیمت فی جلد تین روپے۔ ناشر: ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، یونیورسٹی روڈ۔ الہ آباد۔

مکتوبات نیاز

یہ بالکل درست ہے کہ زمانہ سازی بُری بات نہیں، لیکن اگر اس کے بعد بھی کار برآری نہ ہو، تو پھر کیا فتویٰ ہے؟ وہی خودکشی، جسے آپ حرام کہتے ہیں ـــ جس چیز کا نام ضمیر ہے اس میں شک نہیں بڑی نامعقول شے ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ خود انسان کا وجود ـــ جو مجموعۂ نقایص کے سوا کچھ نہیں ـــ قدرت کی کونسی معقولیت ہے! میں سمجھتا ہوں کہ کائنات ابھی تخلیق و تجربہ سے بھی آگے نہیں بڑھی، تکمیل و تجمیل کیسی! اس لئے بدتمیزی کا یہ دور تو ابھی رہنا ہے اور معلوم نہیں کب تک ـــ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں ـــ جب موت زندگی پر اختیار نہیں، تو پھر خوشحالی و بدحالی کی کیا فکر؟

خدا جانے دنیا میں کتنی قومیں آئیں اور فنا ہوگئیں، مسلمانوں ہی میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہے، پھر افسوس تو مجھے بھی ہوتا ہے، لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں۔ آپ مذہبی اُصول کو لئے پھرتے ہیں، حالانکہ اب وہ فکر فضول سے زیادہ نہیں۔ دنیا میں ہمیشہ مذاہب کو واعظین ہی نے تباہ کیا ہے اور اب بھی یہی ہوگا ـــ اگر آپ اس جماعت کو فنا کر سکتے ہیں تو اپنے بقا کی امید کیجئے، ورنہ خاموشی سے آنکھ بند کر کے چلے جائے، جہاں مولوی لیجائے، خواہ وہ جہنم ہی کیوں نہ ہو!

مرزا صاحب - آداب عرض کرتا ہوں - یہ ریڈیو والا "آداب عرض" ہے صرف آپ کے چونکانے کے لئے۔ ورنہ مقصود "آداب واداب" کچھ نہیں۔ کیونکہ آپ نے دنیا میں کسی سے "ادب و آداب" کی رسم ہی قایم نہیں کی ـــ اچھا تو مدعا یہ کہنا ہے کہ جب سے آپ نے مجھے چھوڑا ہے، اُس وقت سے لیکر تا ایندم پورے ۳۰ سال کے سوانح مجھے سنا ڈالئے۔ آپ کے لئے یہ آسان ہے اور میرے لئے بہت مشکل کیونکہ مجھے تو وہاں کے ایک ایک ذرہ سے محبت ہے، کس کس کو پوچھوں گا اور آپ کس کس کا حال بتائیں گے۔

ہم آپ دونوں جس زمانہ کو چھوڑ آئے ہیں، وہ یقیناً بڑا طوفانی زمانہ تھا، مگر تھا دنیا و مافیہا کو بھلا دینے والا، اس لئے اب کہ کشتی ساحل سے قریب ہے، کیوں نہ ایکبار ان نقوش کی یاد کو تازہ کر لیا جائے۔ غم سے نجات تو خیر کیا ملے گی، لیکن ممکن ہے تھوڑی دیر کے لئے اس بحران میں کمی ہو جائے!

کامیابیاں اور میر سامانیاں مبارک! لیکن آپ نے غالب کا یہ شعر سنا ہوگا:

پیمانہ بران رند حرام ست کہ غالب
در بیخودی اندازۂ گفتار نداند

جوانی خود ایک نشہ ہے، چہ جائیکہ لذائذ تک دسترس! کہ اس صورت میں اگر کوئی بہک جائے تو قدرت کو بھی محاسبہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے!

فیروز کا خط آیا تھا، آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے کیا لکھا ہوگا۔ اب تو آپ کی عمر غالباً چالیس سے متجاوز ہوگی اس لئے ان دل دُکھانے والی اداؤں میں قدرتاً کمی ہونا چاہئے — سایہ کا تعاقب پُرلطف ضرور ہے، لیکن حقیقتوں کا احساس بھی کم دلچسپ نہیں۔ اگر آپ کے پاؤں میں کانٹے نہیں چُبھے، تو تھوڑی دیر ٹھہر کر انھیں کو دیکھئے جو راہ میں بیٹھ کر تلووں سے کانٹے نکال رہے ہیں — ہمدردی نہ سہی، تماشہ سہی!

کتنی تکلیف ہے اس خیال سے کہ اب عرصہ تک آپ کو میری خبر نہ ہو سکے گی! — خود ہی برہم ہونا اور خود ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا! کیا قیامت ہے۔ حیران ہوں کہ اس معذرت کے بوجھ کو کب تک لئے پھروں گا۔ کس کمبخت نے کہا تھا کہ میں آپ کی تحریر سے خفا ہوں، — مگر اس کا کیا علاج کہ جب آپ خود خفا ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ دوسرے ہی کی خفگی کو اس کا بہانہ بنایا کرتی ہیں!

میں نے بیشک فوراً جواب نہ دیکھا، لیکن آپ ہی نے یہ کب لکھا تھا کہ بمبئی کی فضا میں گم ہونے کے لئے آپ پابرکاب ہیں! بہرحال اب تو یہ تحریر صرف "نقشے کرما یاد ماند" کی حیثیت رکھتی ہے، معلوم نہیں نگاہ سے گزرے یا نہ گزرے اور گزرے بھی تو کس وقت!

از غبار شوق طرحِ کعبۂ دل ریختند
گردِ رہ برداشتند و رنگِ منزل ریختند

یہ شعر غالب کا نہیں، جلال اسیر کا ہے۔ لیکن ہے غالب ہی کے رنگ کا۔ آپ کا یہ دھوکا آپ کی خوش ذوقی کی دلیل ہے۔ میرزا مظہر جانجاناں کا ذکر البتہ اس سلسلہ میں بے محل ہے۔ ان کے تغزل کو اس رنگ سے کوئی تعلق نہیں۔ یقیناً انکے کلام میں کہیں کہیں شوخی ضرور پائی جاتی ہے، لیکن غالب کا سا تیز طنزیاتی رنگ کہاں، علاوہ اسکے تراکیب و الفاظ کا وہ شکوہ بھی نہیں جو غالب کا حصہ تھا۔ ہاں جس حد تک جذبات کا تعلق ہے وہ بیشک غالب سے آگے بڑھ کر خسرو و حسن تک پہنچ جاتے ہیں غالب کے محاکاتی رنگ میں وہ زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں:

مخلے خواہم کہ آنجا وصل جاناں رو دہد — گوشۂ ابرو جوابِ گوشۂ ابرو دہد

لیکن یہ ان کا اصلی رنگ نہیں۔ ان کے کلام کی خصوصیت، اس کا کیفیاتِ عشق میں ڈوبا ہوا ہونا ہے مثلاً:

امتحانِ صبرِ عاشق اینقدر ہا خوب نیست — اے بقربانت روم آخر دلم ایوب نیست
غلام عشقم و لطف و کرم بہائے من ست — کسے کہ بندہ بخواند مرا خدائے من ست
مگوئید آہ، پیشِ من مگوئید — کہ معشوقِ کسے عاشق نواز ست
کیست امروز بجز مظہرِ دیوانۂ ما — آنکہ ہر شب بہ تمنائے تو صد بار گریست
نے فرصتِ اشکے، نہ مرا رخصتِ آہے — دارم بہ رخِ دوست غریبانہ نگاہے

باب الاستفسار

متنبّی کی شاعری

(جناب محمد زکریا صاحب - لاہور)

عربی کے مشہور شاعر متنبّی سے مجھے بڑی دلچسپی ہے اور میں نے اس کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن ملک کے اکابر سے بھی فرداً فرداً درخواست کی ہے کہ وہ اپنی رائے اس شاعر کے متعلق لکھ بھیجیں اگر زحمت نہ ہو تو اس کے مختصر حالات اور اس کی شاعری کے متعلق آپ بھی اپنی رائے کا اظہار فرمائیے۔ ممنون ہوں گا۔ میں ان سب کو یکجا شایع کرنا چاہتا ہوں۔

(نگار) متنبّی کے متعلق آپ نے جن ذرایع سے معلومات اس وقت تک حاصل کی ہیں، انھیں ذرایع کو سامنے رکھ کر میں بھی لکھوں گا اور دوسرے بھی، اس لئے میری رائے میں یہ طریقۂ کار مناسب نہیں، ہاں اگر عربی ادیبوں سے اس کی شاعری کے متعلق آپ تفصیلی انتقاد حاصل کر سکیں اور وہ یکجا شایع ہو جائیں، تو بیشک مفید خدمت ہوگی۔

متنبّی پر کافی لٹریچر موجود ہے۔ عبداللہ اصفہانی کی: یضاح المشکل، عبدالقادر بغدادی کی خزانۃ الادب، ثعالبی کی تیمیۃ الدہر، خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد، ابن الانباری کی نزہت الالبار، صمعانی کی انساب، ابن خلکان کی وفیات الاعیان اور الصبح المتنبّی وغیرہ بہت سی کتابیں موجود ہیں، جن سے آپ کو اس کے حالات اور اسکی شاعری کی اہمیت کا علم ہو سکتا ہے۔

اس کا پورا نام معہ کنیت کے 'ابوطیب احمد بن الحسین الجُعفی تھا، ۳۰۳ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوا۔ اس نے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کیا اور اسوقت کے اشعار بھی اسکے معنوی نزاکت سے خالی نہ ہوتے تھے۔ اس نے اپنی جوانی کا ابتدائی زمانہ شام کے بدویوں میں بسر کیا اور وہیں اس نے زبان پر عبور حاصل کیا۔ آدمی چونکہ بڑے حوصلہ کا تھا اور لیڈر بننے کی اسے بڑی تمنا تھی، اس لئے محض اپنی شاعری کی شہرت پر وہ مطمئن نہ ہو سکا۔ اور ۳۲۰ھ میں نبوت کا دعوی کر بیٹھا نتیجہ یہ ہوا کہ گرفتار ہوا اور جب کچھ دن بعد رہائی ملی تو سیف الدولہ کے دربار میں اسے رسائی ہو گئی اور یہاں بڑے بڑے شاعروں سے اپنا لوہا منوالیا۔ ابوالعلاء ایسا مشہور شاعر بھی اسے ابونواس اور بحتری سے بہتر شاعر سمجھتا تھا۔

جیسا کہ درباروں کا قاعدہ ہے کچھ لوگ اس کے دشمن ہو گئے اور سیف الدولہ کو اس سے برہم کر دیا، یہاں سے یہ دمشق چلا گیا اور یہاں سے کافور حاکم مصر کے بلانے پر مصر پہونچا۔ یہاں بھی وہ زیادہ دن نہ رہ سکا اور بھاگ کر